

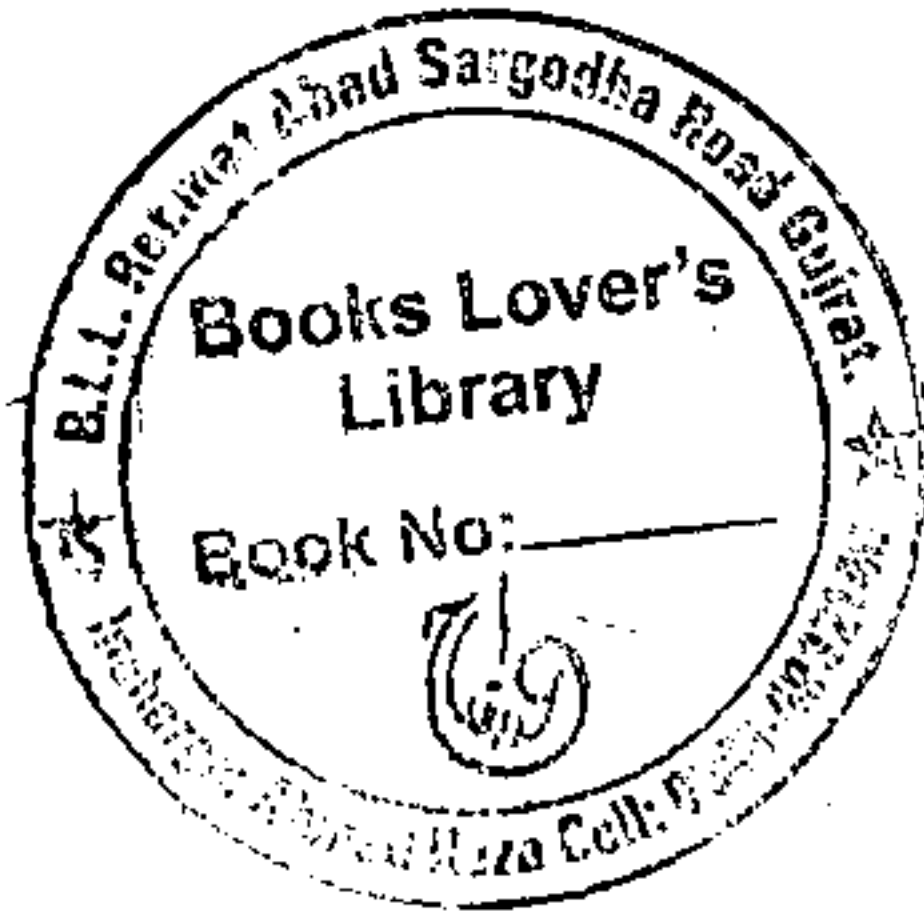
# گرگ و گلشن

راجندر سنگھ بیدی



# کوکھ جلی

راجندر سنگھ بیدی



سیونٹھ سکائی پبلی کیشنز

غزنی سٹریٹ الحمد مارکیٹ 40- اردو بازار، لاہور

فون: 37223584، موبائل: 0300-4125230

## جملہ حقوق محفوظ

کوکھ جلی	.....	نام کتاب
راجندر سنگھ بیدی	.....	مصنف
سیونٹھ سکائی پبلی کیشنز، لاہور	.....	ناشر
زاہدہ نوید پرنٹرز، لاہور	.....	مطبع
جنوری 2014ء	.....	سن اشاعت
200/= روپے	.....	قیمت

..... ملنے کے پتے .....

## علم و عرفان پبلشرز

الحمد مارکیٹ، 40۔ اُردو بازار، لاہور

کتاب گھر	اشرف بک ایجنسی
اقبال روڈ، کمیٹی چوک، راولپنڈی	اقبال روڈ، کمیٹی چوک، راولپنڈی
ویلم بک پورٹ	خزینہ علم و ادب
اُردو بازار، کراچی	الکریم مارکیٹ، اُردو بازار، لاہور
رشید نیوز ایجنسی	جہانگیر بکس
اخبار مارکیٹ، اُردو بازار، کراچی	بوہڑ گیٹ، ملتان
شمع بک ایجنسی	کشمیر بک ڈپو
بھوانہ بازار، فیصل آباد	تلہ گنگ روڈ، چکوال

ادارہ کا مقصد ایسی کتب کی اشاعت کرنا ہے جو تحقیق کے لحاظ سے اعلیٰ معیار کی ہوں۔ اس ادارے کے تحت جو کتب شائع ہوں گی اس کا مقصد کسی کی دل آزاری یا کسی کو نقصان پہنچانا نہیں بلکہ اشاعتی دنیا میں ایک نئی جدت پیدا کرنا ہے۔ جب کوئی مصنف کتاب لکھتا ہے تو اس میں اس کی اپنی تحقیق اور اپنے خیالات شامل ہوتے ہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ آپ اور ہمارا ادارہ مصنف کے خیالات اور تحقیق سے متفق ہوں۔ اللہ کے فضل و کرم، انسانی طاقت اور بساط کے مطابق کمپوزنگ، طباعت، تصحیح اور جلد سازی میں پوری احتیاط کی گئی ہے۔ بشری تقاضے سے اگر کوئی غلطی یا صفحات درست نہ ہوں تو ازراہ کرم مطلع فرمادیں۔ انشاء اللہ اگلے ایڈیشن میں ازالہ کیا جائیگا۔ (ناشر)

## معروضات

قارئین کرام! آپ جانتے ہیں کہ مکتبہ جامعہ لیسٹڈ ایک قدیم اشاعتی ادارہ ہے، جو اپنے راضی کی شاندار روایات کے ساتھ آج بھی سرگرم عمل ہے۔ 1922ء میں اس کے قیام کے ساتھ ہی کتابوں کی اشاعت کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا جو زمانے کے سرد و گرم سے گزرتا ہوا آگے کی جانب گامزن رہا۔ درمیان میں کئی دشواریاں حائل ہوئیں، نامساعد حالات سے بھی سابقہ پڑا مگر سفر جاری رہا اور اشاعتوں کا سلسلہ کئی طور پر کبھی منقطع نہیں ہوا۔

اس ادارے نے اردو زبان و ادب کے معتبر و مستند مصنفین کی سیکڑوں کتابیں شائع کی ہیں۔ بچوں کے لیے کم قیمت کتابوں کی اشاعت اور طلباء کے لیے ”درسی کتب“ اور ”معیاری سیریز“ کے عنوان سے مختصر مگر جامع کتابوں کی تیاری بھی اس ادارے کے مفید اور مقبول منصوبے رہے ہیں۔ ادھر چند برسوں سے اشاعتی پروگرام میں کچھ تعطل پیدا ہو گیا تھا جس کی وجہ سے فہرست کتب کی اشاعت بھی ملتوی ہوتی رہی مگر اب برف پگھلی ہے اور مکتبہ کی جو کتابیں کمیاب بلکہ نایاب ہوتی جا رہی تھیں شائع ہو چکی ہیں۔ زیر نظر کتاب اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ اب تمام کتابیں مکتبہ کی دلی، ممبئی اور علی گڑھ شاخوں پر دستیاب ہیں اور آپ کے مطالبہ پر بھی روانہ کی جائیں گی۔

اشاعتی پروگرام کے جمود کو توڑنے اور مکتبہ کی ناؤ کو بھنور سے نکالنے میں مکتبہ جامعہ بورڈ آف ڈائریکٹرز کے چیئرمین اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کے وائس چانسلر جناب نجیب جنگ (آئی اے ایس) کی خصوصی دلچسپی کا ذکر ناگزیر ہے۔ موصوف نے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے فعال ڈائریکٹر جناب حمید اللہ بھٹ کے ساتھ (مکتبہ جامعہ لیسٹڈ اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے درمیان) ایک معاہدے کے تحت کتابوں کی اشاعت کے معطل شدہ عمل کو نئی زندگی بخشی ہے۔ اس سرگرم عملی اقدام کے لیے مکتبہ جامعہ کی جانب سے میں ان صاحبان کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ امید ہے کہ یہ تعاون آئندہ بھی شامل حال رہے گا۔

خالد محمود

نیجنگ ڈائریکٹر، مکتبہ جامعہ لیسٹڈ

# فہرست

5  
15  
34  
51  
66  
78  
101  
110  
123  
131  
143

ک۔	لمس
۲۔	بیکار خدا
۳۔	کو کھ جلی
۴۔	نامراد
۵۔	جب میں چھوٹا تھا
۶۔	آخری اسٹیشن
۷۔	کشکش
۸۔	گالی
۹۔	ایک عورت
۱۰۔	خطِ مستقیم اور توسین
۱۱۔	ماسوا





سیکڑوں سیٹیوں کے ساتھ مجمع سے ہمنوا ہو رہا تھا۔ . . . . ہجوم کے وسط میں سے سانپ آیا سانپ آیا کی آواز سے آتش بازی کا سا ایک انار چھوٹا اور بظاہر شیرازہ بکھر گیا، لیکن دائیں بائیں سے ہاتھی آیا، کے لایعنی نعروں سے پھر لوگ جمع ہو گئے۔

چبوترے کے سنگِ خارہ پر کچھ سنہری الفاظ کندہ تھے۔

سرجوارام

۱۸۶۲ء سے لے کر ۱۹۳۱ء تک

ایک بڑا سخی اور آدم دوست

ہجوم اور الفاظ ایک دوسرے کو مسلسل گھور رہے تھے۔ ”گپت دان کیا کرتے تھے ہمیشہ۔۔۔۔۔ سیوا سمی کا ایک رضا کلا اپنے سرخ سکارف کی گرہ کو ڈھیلا کرتے ہوئے بولا۔۔۔۔۔ ”بڑھے نالے کے پار جو رہو آٹھرم ہے نا، اس کی درمی اٹھائی گئی اور اس کے نیچے پیواؤں کی مدد کے لیے پانچ سو کے نوٹ ملے،“

”چہ۔۔۔ تو کیا ہوا؟۔۔۔۔۔ ہجوم میں سے ایک طرف سے باز ٹوانہ بولا:

۔۔۔۔۔ بات یہ تھی کہ سخاوت بے طریقہ تھی، اور کسی یا بونے تائید کرتے ہوئے کہا: اس میں عبور لوں کی ٹریفنگ زیادہ ہوئی اور کیا حاصل ہوا؟۔۔۔۔۔ لیکن جناب۔۔۔۔۔ ”کوئی بولا: ”آپ کو ان کی نیت میں کوئی شک نہیں ہو سکتا، یہ تو منتظمان کی حرام زدگی ہوگی، اور ایک گیانی جی اپنی چنبل سے بھری ہوئی گردن کو کھجاتے ہوئے بولے ”گیتا میں صاف لکھا ہے کہ دانی کو اپنے دان کا پھل پراپت کرنے کے لیے پھر جنم دھارن کرنا ہوتا ہے۔“

ہجوم کا شور نسبتاً بلند ہو گیا۔ ”یونیورسٹی ہال اور اس کے وسیع برآمدے

میں طلبہ جیو میٹری کے پرچے دے رہے تھے۔۔۔۔۔ مثلث میں دو خطوں

کی مجموعی لمبائی تیسرے خط کی لمبائی سے زیادہ ہوتی ہے۔ ایک طالب علم نے سوچا اور اس کا جی چاہا کہ وہ تمام کاغذ پھاڑ کر سیاہی انڈیل کر سانسے رقصاں و خنداں، لرزاں و حیراں ہجوم میں شامل ہو جائے۔ بڑے زور سے چیخے اور کہے ہیں اس جو میٹری کا فائدہ ہی کیا۔ شور مچا دے اہل وطن۔۔۔ اور فقط شور۔۔۔ اور کان پڑی آواز سنائی نہ دے۔۔۔ صاحب سپرنٹنڈنٹ نے زور زور سے کچھ ہاتھ گھنٹی پر مارے لیکن گھنٹی کی آواز بھی شور میں حل ہو کر رہ گئی۔ وہ بوکھلا کر اٹھے اور خود باہر آ کر مجمع سے مخاطب ہوئے۔۔۔

”جناب آپ لوگوں کو اس بات کا خیال ہونا چاہیے۔۔۔“

دُبلے پتلے بے بصاعت سپرنٹنڈنٹ کی بقیہ آواز ایک لامتناہی غلغلے میں گم ہو کر رہ گئی۔۔۔ لوگ ہنسنے لگے۔ اس بات کا خیال ہونا چاہیے، خیال لیے پھرتا ہے۔۔۔ جا بیٹھ اپنی ماں کے پاس، ورنہ ڈھونڈتی پھرے گی اپنی عینک۔۔۔ اپنی ریڑھ کی ہڈی۔۔۔ جا جا۔۔۔ اس کے بعد کاروں کی پولوں، پولوں، فٹنوں اور عیسی ٹانگوں کی ٹن ٹن سے فضا اور بھی پُر شور ہو گئی۔ ایک سارجنٹ کہیں سے نمودار ہوا اس نے لبوں پر زبان پھیری۔ ہیٹ کو اونچا کیا اور اپنا بیٹن تان کر ہجوم میں یوں گھومنے لگا جیسے کوئی تیز سی چھری خر بوزے میں پھر جائے۔۔۔ کاروں کو ادھر پارک کرو۔ اے یوانڈین۔ دائیں طرف! سیاہی بولا: ”آپ کا نمبر کیا ہے۔ پی پی ۵۷۳، اور لائسنس؟“ یہ لائسنس دیکھنے کا وقت ہے۔“

”ہو ہو ہو۔۔۔“

”راجا صاحب ہیں کہاں؟“

”ارے نمایاں کھینچ دو بت کی رسی کو خود ہی۔ آخر اس تکلف میں کیا دھرا



۷۶

"ہونا ویسی وقت....."

"چہ ایک... بڑا... آدم دوست!..."

پھر دیہانی بھائی پھیرا اور اس کے نواح سے شہر کا کوئی سیلہ یا عجائب گھر  
 دیکھنے چلے آئے تھے ان کے ہاتھوں میں لکڑی کے لمبے لمبے ٹکڑے تھے جن کے سروں  
 پر لکڑی کے "چوہے" بندھے ہوئے تھے۔ ان کے دُموں سے گاتو ہیں بانی  
 ہوئی سن کی رسیاں لٹک رہی تھیں جنہیں وہ کھینچتے اور کھڑپ کھڑپ کا بے ہنگم  
 بے معنی، بے تال ساز بجاتے اور گاتے۔ "کھٹن گاتے کھٹ کے لیاندرا  
 جھانواں....."

"راستہ چھوڑ دو۔ راستہ چھوڑ دو....." ہجوم آپ سے آپ پھٹنے لگا۔ اور  
 ایک کشمیری پنڈت زار و نحیف، قیصر ولیم کی سی ڈاڑھی چھوڑے، دانتوں سے  
 اپنے ناخن کاٹتا ہوا چبوترے کی طرف بڑھنے لگا۔ اس کے گلے کا سنہری سروپا  
 اس کے گھٹنوں کو پھانسی رہا تھا۔ بار بار وہ جھک کر سروپا کو گھٹنے سے علاحدہ  
 کرتا..... سب ادا یہ عزت و افتخار کا نشان اسے سرنگوں کر دے.....  
 یہ راجا صاحب تھے جن کے ہاتھوں بت کی نقاب کشائی ہونا تھی زندگی  
 کے ہر تجربے نے ایک لکیر ان کے چہرے پر ڈال دی تھی۔ کہیں کہیں خطوط  
 کے مخمضے پڑے ہوئے تھے جن میں نیلی نیلی وریدیں اچھتی سلکتی ہوئی ایک بڑی  
 سی گانٹھ کی صورت میں کپٹی کے قریب نمایاں ہو گئی تھیں۔ جب یہ راجا، یہ  
 نقاب کشا مرے گا تو اس کا بت بہت حسین بنے گا۔ کسی نے سنگتراش کے نقطہ  
 نگاہ سے جانچا۔ آج کسی کی نقاب کشائی کرتا ہے، کل اسی اس کی نقاب  
 کشائی کرے گا۔ گویا راجا مہندر ناتھ کوئی بہت بڑا جرم کر رہا ہے

## کو کھ جلی

کسی کی بہو بیٹی کی طرف دیکھتا ہے۔ ہجوم ہمیشہ ہمیشہ ہجوم ہی رہتا ہے۔۔۔۔۔  
 اس وقت دیہاتی اپنے بے ہنگم گیت کا دوسرا مصرعہ گارہے تھے: کھٹن گیانے  
 کھٹ لیاندا جھاواں، نے جاندی داری دس نہ گیا میں چھیاں... کدھر نو پاواں  
 ... اور بدستور چو ہوں کی کھٹ کھٹ سے ہجوم کی بے ربط آوازوں میں چند  
 اور کا اضافہ ہو رہا تھا۔۔۔۔۔

سیواسمتی والوں نے لٹھوں کو تانے ہوئے ہجوم کے ایک بڑے سے  
 ریلے کو روک دیا۔ راجا صاحب نے اپنے منہ میں ثعلب مصری کا ایک ٹکڑا  
 اور لالچی ڈالی اور گلے کو "اوہوں، اوہوں" کی متعدد آوازوں سے صاف  
 کرتے ہوئے بولے "..... حضرات! ایسویں صدی میں ایک معجزہ ہوا اور  
 وہ سر جیوارام کی پیدائش تھی... لوگ معجزے کے متعلق سوچنے لگے...  
 عام آدمیوں کی طرح جیوارام بھی پیدا ہو گیا... ہا ہا ہا... کیا روح القدس آیا تھا... کچھ  
 آدمیوں کے گالوں پر فی الواقع آنسو بہ رہے تھے، ان کے دل میں سخاوت اور آدم دوستی کا جذبہ  
 اس قدر بلند ہو چکا تھا کہ وہ مال اور دولت اور بیوی تک سخاوت میں دے دینے کے لیے تیار ہو رہے تھے  
 سیواسمتی کے ایک کارکن نے دو دفعہ نقاب کی رسی راجا کے ہاتھوں  
 میں دی اور وہ دونوں دفعہ پھسل گئی جس کا مطلب تھا کہ راجا کا جلد ہی مجسمہ  
 بن جائے گا۔ آخر راجا جانے ایک جھٹکا دیا اور مجسمہ بے نقاب ہو گیا۔۔۔۔۔

لوگوں نے تالیاں بجائیں، پھول پھینکے... آخر یہ بات تھی! پھر وہ سوچنے  
 لگے۔ وہ ناحق دو گھنٹے کھڑے رہے۔ لیکن مجسمہ خوبصورت تھا، مرمریں بالکل  
 روئی کا ایک بڑا سا گالا دکھائی دیتا تھا۔ سنگ مرمرو کو کسی اطالوی نے  
 اس قدر صفائی سے تراشا تھا کہ فرغل کی ایک ایک ٹنگن واضح طور پر نظر  
 آرہی تھی۔ سو پتھروں کے بل صاف دکھائی دے رہے تھے یہ سو پتھریں بت اپنی

زندگی میں لب لگا کر بٹا کرنا تھا اور پھر ہاتھ کی رگیں بھی دکھائی دے رہی تھیں یہی محسوس ہوتا تھا جیسے ہاتھ ابھی حرکت میں آجائے گا، ایسے ہی جیسے نقاب کشا کا ہاتھ بت بن جائے گا۔ بت اور نقاب کشا میں کوئی رازداری تھی۔ انہیں ایک دوسرے سے کوئی خاص ہی ہمدردی تھی۔

شور اور بھی بلند ہو گیا۔ ہال کا مسمخ منہ پر جھاگ لانے لگا۔ اس نے ایک ہاتھ سے عینک کو سنبھالا، دوسرا ہاتھ ریڑھ کی ہڈی پر رکھا اور حلقے کے تھانے کو ٹیلیفون کرنے کے لیے ایک چھوٹے مسمخ کو اپنی جگہ پر بٹھا دیا۔

المتاس کے درخت تمون کی پتلیاں نچا نچا کر ہنسنے لگے۔ کروٹن چیل سڑک کی ساٹوری صورت کو چومنے کی خواہش میں سائیں سائیں کرتا ہوا جھک جھک گیا۔ اس وقت سورج کے سامنے ایک بہت بڑا بال آجانے سے سڑک کا جذام دور ہو چکا تھا۔ ہلکی ہلکی گد گدی کی طرح ایک خوشگوار پھواری پڑنے لگی۔ بت کے رشتہ دار، نیم بت، دیوتاؤں کی اس خوشنودی کے اظہار پر بہت خوش ہوئے۔ آخر خدا کو بھی ان کے باپ یا دادا کی سخاوت اور آدم دوستی پسند تھی۔

نقاب کشائی کے بعد بھی ہجوم کی سمجھ میں کچھ نہ آتا تھا۔ لوگ ابھی تک آنکھیں جھپک رہے تھے۔ کیا بس یہی معاملہ تھا؟ کیا وہ صرف اسی بات کے لیے دو گھنٹہ کھڑے رہے تھے؟ مجسمہ برف کی طرح سفید ہے، برف کی طرح منجمد! لیکن آخر بات کیا ہوئی؟

۱۸۶۳ء سے لے کر ۱۹۳۱ء تک — اُونہہ! کیا پتا وہ کبھی پیدا ہی

نہ ہوا ہو؟

”اس کا مطلب ہونا کہ اڑسٹھ سال“



ننگے سے پانی کا ایک گھونٹ پی کر اسے نکل گیا۔ پانی کے قطرے ابھی تک اس کی بے قابو ڈاڑھی میں بہہ رہے تھے۔ پانی پنی کر وہ بجھتے کے قریب آیا اور اپنے ساتھی سے پوچھنے لگا: "اوائے بننا سینہاں! اوکیہہ لکھیا ہئی ہرارے بنتا سنگھ یہ کیا لکھا ہے؟" بنتا سنگھ نے جواب دیا لکھا ہے: "ایک بڑا سخی اور آدم دوست"۔ "اونہہ! بڑا سخی۔ ائیہی بولا..."

دراصل کسی کو سر جو آرام کی سخاوت پر یقین نہ آتا تھا۔ ہجوم کے ذہن لاشعور میں کوئی بات تھی۔ اس کی روح کی گہرائیوں میں کوئی ایسا جذبہ تھا جس کے تحت وہ کہہ رہے تھے: "کوئی سخاوت نہیں"۔ کوئی آدم دوستی نہیں۔ سب جھوٹ ہے۔ سراسر جھوٹ ہے۔

بجھتے کی حقیقت کی نسبت انہیں سیوا سمیٹی والوں سے زیادہ نفرت تھی جو کہ ابھی تک ڈٹ کر کھڑے تھے۔ ائیہی، دیہاتی بابو، طالب علم سب کا خیال تھا کہ سمیٹی والے ازل تک یہاں سے نہیں ہلیں گے۔ وہ چاہتے تھے یہ لوگ ایک دم وہاں سے چلے جائیں۔ ان کی موجودگی ہجوم میں ایک خاص قسم کا جذبہ متنفر اور بغاوت پیدا کر رہی تھی۔ ان کا جی چاہتا تھا کہ وہ کسی کو مار ڈالیں، کچھ توڑیں پھوڑیں، سڑک پر سے گزرتی ہوئی عورتوں کی عصمت دری کریں۔ اور نہیں تو طفل خورد سال کی طرح منہ ہی چڑا دیں۔ وہ منہ چڑانے سے ڈرتے نہ تھے، اگرچہ ان کے چہرے چہرے دانٹوں پر سے اینٹل اڑ چکا تھا اور وہ مکمل طور پر سیاہ پڑ گئے تھے۔ بے احتیاطی اور گوشت خوری نے ان کے دانٹوں کو جبروں تک کھوکھلا کر دیا تھا اور وہ جبروں سے تقریباً علاحدہ ہو چکے تھے۔ لوگ بنا جانے بوجھے ان کو وہ دانٹوں کا مظاہرہ کر کے خوش ہو رہے تھے۔ وہ یہ نہیں جانتے تھے کہ ان





اسی اثنا میں اپنے گلے کو خون سے صاف کرتے ہوئے سیوا سمیٹی کا سینا پتی آگیا اور جو ترے کے پاس پہنچ کر اپنی کھڈر کی بنگر کو عریانی کی حد تک اونچا کرنے لگا۔ پھر اس نے رضا کاروں کو ایک لکڑی قطار میں کھڑے ہونے کا حکم دیا اور اس کے بعد وہ حکم کے مطابق چلنے لگے....

لوگ خوش تھے۔ انہوں نے رضا کاروں کے پیچھے تالیاں بھائییں۔ یہ بہتر تزیین تھی۔ بد نما دانت اور جڑے دکھائی نہیں دیتے تھے۔ سینا پتی نے ختم آلود نگاہوں سے پیچھے کی طرف دیکھا۔ گلے کو سہلایا اور چل دیا۔ لوگوں نے ہتھروں کی طرح کے وزنی قبچھے پھینک کر رضا کاروں کو زخمی کر دیا۔ سیوا کا پھل میوہ —

سب جانتے تھے کہ مجسمہ سنگ مرمر کا ہے، سفید ہے، سخت ہے۔ لیکن اتنی بات سے ان کی تسلی نہیں ہوتی تھی، وہ سات آنٹھ قدم کے فاصلے پر کھڑے ہوتے، ایک نظر مجھے کو دیکھتے پھر سب کے سب اس تک پہنچ کر اُسے اپنے ہاتھوں سے چھو دیتے۔

”ہیں انگریزی نہیں جانتا۔ ایک دیہاتی نے کہا:

سر جیوارام کا بت ہے جو ۱۸۴۲ء میں پیدا ہوا، اور ۱۹۳۱ء میں مر گیا۔ وہ ایک بڑا سخی اور آدم دوست انیسویں صدی کا سب سے بڑا معجزہ۔ اب نجوم نے اثبات میں سرٹلا دیا اور ایک دفعہ پھر اپنے ہاتھوں کی پہنچ تک بت کو محسوس کیا۔ کچھ دیر بعد بت کے پاؤں سیاہ ہو گئے۔۔۔ لیکن اس کے بعد سب اطمینان کے ساتھ اپنے اپنے کام پر چلے گئے۔

## بیکار خدا.

یہ دکان کچھ دنوں سے بند تھی۔ خدا جانے اس کے مالک کہاں مر کھپ گئے تھے۔ باہر لکڑی کے بڑے ڈپر مڑاری جین نے کچھ سوئی اور کچھ ریشمی چوٹیاں جھوٹے موٹیوں کی چوڑانیاں اور بانکڑی وغیرہ رکھ لی تھی۔ اتنا دکان معمولی حیثیت کی عورت چوک مولاداد سے چپل۔ ہفتہ تک گزرتی ہوئی کبھی کبھار یہاں رک جاتی تھی۔

کچھ مال تو یہاں بک جاتا تھا لیکن یہ نہیں کہتا بندھ جائے۔ جو ہر دکاندار کی خواہش ہوتی ہے، جو کچھ نہ بکے تو سمجھ لو کہ مڑاری جین کے چار پانچ بچو ننگے، بیوی اور ایک آدمی کے ٹکڑوں پر پلنے والے عزیز پیٹ بجانے لگتے ہیں اور جو بکری زیادہ ہونے لگے تو وسوسہ پائے دکان کا مالک اب آیا کہ، اب آیا۔ اور پھر یہ کمیہ خواہش کہ وہ کبھی نہ آئے یوں ہی کہیں چلتا ہوا ڈھیر ہو جائے۔ نہیں تو سب جھانجن۔ وانجن اور بانکڑی وانکڑی سڑک پر پڑی نظر آئے گی۔ اور جو کہیں اوپر سے معمول لاہتہ ہو جائے تو وہ علاحدہ۔ مڑاری جاننا تھا، آخر اسے بڑا دسے الگ ہونا ہی پڑے گا۔

اسے پھر آیا کبخت — سپا ہٹا۔۔۔۔۔ مراری عین اطمینان سے دکان لگا رہا تھا، لیکن سپا ہی کو دیکھ کر ہڑبڑا اٹھا۔ یہ ایک تیسرا خطرہ تھا جو مال کے بکنے یا دکاندار کے واپس آجانے کے خدشے سے کہیں بڑا تھا۔ یہ لال پگڑی والا صبح و شام دونوں وقت اپنے راؤنڈ پر ادھر آتا تھا، جو کوئی حکمت سے کھلا پلا دے تو بہتر ورنہ مراری کی قسم کے خواہ مخواہ بدوش اور عارضی دکانداروں کے سنگھاڑے اور شکر قندی بیچ بازار کے پگڑی ہے۔ سب ہنس رہے ہیں۔ کوئی ہمدردی کا اظہار نہیں کرتا۔ گرنا بکر جانا بلات ہی ایسی ہے کہ اسے دیکھ کر سب ہنسنے لگتے ہیں۔ یا ایک سے گیارہ سا نرتیک کے بڑے بڑے بد وضع چیل، ننھے ننھے پیارے پیارے سلپروں کے ساتھ سڑک پر روندے جا رہے ہیں۔ لوبیا اور آنسو مٹی میں مل رہے ہیں، ستری موج میں آئے تو چوٹی اٹھتی قبول، نہیں تو فرعونیت جوں کی توں قائم ہے۔ اور ابھی بے نفرت سے بھرپور مراری عین لال پگڑی والے کو ”سپا ہٹا کہا کرتا تھا۔“

”آج مرے رام رے۔۔۔۔۔“ مراری نے کڑکڑاتی ہوئی آواز نکالی اس مینڈک کی طرح جس پر کسی کا پانا ٹوٹا جائے۔ مراری کا خطاب اپنے گاہک سے تھا۔ گاہک نے ہٹ کر دیکھا مراری کا نپ رہا تھا۔  
 نتمو گاہک نے دور لال پگڑی دیکھی، اور ہاتھ جھٹکتے ہوئے بولا  
 ”ناحق مرے جا رہے ہو یا۔“

مراری نے سودا بیچنے سے انکار کرتے ہوئے کہا: ”نہیں بھائی تو پھر کسی وقت آجانا۔ میں اس وقت سب چیزوں پر کپڑا ڈال کر بھاگ جاؤں گا۔“ یہ چھو کر رہے گا یہاں۔ اور ایک غلیظ چھو کر ابرہاؤ

کے ایک طرف بیٹھا، اپنا دامن منہ میں پھول رہا تھا، وہ مراری کا بیٹا تھا لیکن مراری کو اتنی فرصت نہ تھی کہ اسے منع کرے۔ اس نے اپنے ماتھے پر دھمپینہ پونچھتے ہوئے کہا: ایسے چھوٹے بچے کو تو بچھرنہ کہے گا۔  
مجھے نہ دیکھ کر شاید مل جائے۔“

نتھو نے ادھر ادھر دیکھا۔ اس لیے کہ کوئی اور دکان کھلی ہے یا نہیں لیکن مراری نے اس کے کندھوں کو شفقت سے چھوتے ہوئے کہا: تم میرے پہلے گاہک ہو۔۔۔ مہا ویر کی سوگند، میں تمہیں نہیں ٹوٹاؤں گا۔“

نتھو نے تہ بند کوراؤں میں دبا پا، سر کو کھجایا اور آچک کر مراری کے گھسے ہوئے آسن پر بیٹھ گیا۔ نتھو ایک قلی کے کپڑے پہنے ہوئے تھا سب سے پہلے اس کی جس چیز پر نگاہ پڑتی تھی وہ اس کی ناک تھی جو دس بارہ سال پہلے ایک رنڈی نے کاٹ لی تھی۔ تب سے وہ بیفتے میں ایک بار پھاہا لگانا آج پھاہا لگے شاید ساتواں دن تھا وہ جو بہت گندہ نظر آتا تھا دوسری چیز نتھو کا موٹا پا تھا جس کے سبب وہ گرمیوں میں کوئی بھی کام کرنے کے اہل نہیں تھا۔

نتھو نے اپنے بے تماشائے پھیلے ہوئے دامن میں سے کہیں سے ایک بیٹری نکالی اور اسے سلگاتے ہوئے بولا۔۔۔ آج ہمارا پونکھا لو دیکھو پھر کیا ہوتا۔۔۔

مراری نے رشک کی نگاہ سے اس مفلس مگر مطمئن انسان کی طرف دیکھا اور کہنے لگا: تمہارا پونکھا ہی سہی، دیکھ لیتے ہیں، تم کیا کرتے ہو۔۔۔ اور مراری کو ایک طرح کا اطمینان حاصل ہو گیا، گویا یہ قلی اسے بچائے گا۔ صبح سویرے کون زربائش کا سامان خریدنے آتا ہے؟

یہ درحقیقت کسی بڑی طاقت کا بھیجا ہوا ہے، صرف مجھے بچا لے بھگوان کے بھگت پیڑت ہوتے ہیں تو ان کی رکشا ہوتی ہے۔ کوئی انسان بہانا بن جاتا ہے۔ مراری نے پھر ایک بار نتھو کی طرف دیکھا۔ جو بیڑی کا دھواں چاروں طرف پھیلا رہا تھا۔ جس سے افشاں کے کانے ہو جانے کا ڈر تھا... . . . کچھ سوچتے ہوئے مراری وہاں سے ٹل گیا۔ سپاہی سے آنکھ پڑانے کے لیے وہ رفاہ عام کے لیے لگے ہوئے کنوئیں کی ٹوٹی کھول کر غٹ غٹ پانی پینے لگا۔ گویا اسے کسی بات کا پتا ہی نہیں۔

سنتری اپنی جھالر کو سنوارتے ہوئے گزرا تو اس نے نتھو بے فکرے کی طرف دیکھا۔ ایک بڑی بیماری چھوٹی بیماری کو کچل دیتی ہے، سنتری دکان میں آسن پر بیٹھے ہوئے آدمی کے سوا اور کسی چیز کو نہ دیکھ سکا۔ یا اس نے کسن بچے کی طرف دیکھا جو دامن چھوڑ کر اپنا کف چوس رہا تھا۔ جسے مراری دور کھڑا منع کرنا چاہتا تھا لیکن کر نہیں سکتا تھا۔ جب سپاہی انھیں دیکھ رہا تھا تو مراری جین کو آسمان نیچے اور زمین اوپر نظر آنے لگی۔ سپاہی نے نتھو سے کوئی بات نہ پوچھی۔ الٹا نتھو اسے دیکھتا رہا۔ آخر جب وہ دکان کے قریب سے گزرا تو مراری کے گاہک نے آسن ہی پر سے آواز دی۔

”سنتری جی! میں میں... ذرا زیادہ شی ہی رکھیے گا!“

سپاہی نے تسلیم کے انداز میں سر ہلا دیا اور پیٹی کے پیچھے اپنی انگلی پھنساتے ہوئے مسکرا دیا۔ اس وقت مراری کو خیال آیا کہ اس نے بہت پانی پی لیا ہے۔ پیٹ میں ایک قطرے کی بھی گنجائش نہیں۔ اس کے باوجود اسے پیاس لگ رہی ہے۔ دھوئی سے اپنا منہ پونجھتے ہوئے





اور پھر خود ہی بولا۔۔۔۔۔ جب ننگا آدمی نظریں پٹی کر لیتا ہے تو لوگ اسے دیکھتے ہیں۔ جب وہ سب کو دیکھتا ہے تو لوگ ننگا ہیں پٹی کر لیتے ہیں؛ گاہک نہیں جانتا تھا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے اور دکاندار نہیں سمجھتا تھا کہ وہ کیا سن رہا ہے۔ وہ دونوں ہنس دیے، اور ننھا سٹالز کا روتا رہا وہ اس کے وہاں ہونے سے بھی بے خبر تھے۔

”دولٹری کا کیا لوگے؟ ننھو نے پوچھ لیا۔

”جو جی چاہے دے دینا“

”یوں کام نہیں بنے گا لالہ“

تم میرے پہلے گاہک ہو، تم سے بوہنی کر رہا ہوں۔۔۔۔۔ تمہارا پونگھا لے رہا ہوں، تم سے دوسری بات کرنا اپنا دھرم نہیں ہے۔ اور پھر مرادی جین نے دل میں سوچا یہ دکاندار ہی نہ ہوئی، سدا ابرت ہوا۔ لیکن اس کا جی نہیں چاہتا تھا، ننھو سے دام لے کر کچھ دیر مہکلا نے کے بعد مرادی نے کہا۔۔۔۔۔ بارہ آنے۔ اور یہی اس کی قیمت خرید تھی۔ ننھو نے مشکوک انداز میں مرادی کی طرف دیکھا اور بولا۔۔۔۔۔ ”بازار سے دس آنے میں مل رہی ہے، چھوٹی دولٹری۔۔۔۔۔ ابھی کل ایک دکاندار لے رہا تھا۔۔۔۔۔ مرادی جین نے گاہک کی طرف دیکھا اور مسکراتے ہوئے بولا۔۔۔۔۔ ”دس آنے ہی دے دو بابا“ ننھو نے جھجکتے ہوئے دس آنے دیے اور نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

شام کے چھ بجے کے قریب مرادی کا اسپا ہٹا، پھر وہاں سے گزرا لیکن اب کے اس نے مرادی کی دکان کی طرف نظر اٹھا کر نہ دیکھا ایک دو مرتبہ کھٹکارنے کے بعد اس نے شام لگی ہوئی لاکھی کو دوبارہ پکی سٹریک پر

ماتا، لیکن اس کھنکارنے کا مطلب گلے کے نفع سے زیادہ کچھ نہ تھا، اور زمین پر لاٹھی مارنا زمین پر لاٹھی مارنا تھا۔ شام کے قریب یہاں ایک عرس ہوا جس میں عورتوں کو چوٹیوں کی ضرورت تھی۔ مراری جین کی دکان کی جگہ اگر کوئی بھی دکان ہوتی تو پھلتی پھولتی۔ مراری کو عرس کا پتا بھی تھا، لیکن وہ جی ہی جی میں نٹھو کے پونکھے کو سراہ رہا تھا۔ اگر کہیں وہ ہر روز ادھر آجائے تو شاید اسے اسی دن کی طرح گھٹنا سیدھا کرنے سے پہلے پانچ چھ روپے کی آمدنی ہو جایا کرے۔ وہ چوٹی بیچتا تھا۔ افشاں بیچتا تھا۔ اور نٹھو کے متعلق سوچتا تھا۔ کس قدر موٹا ہے جیسے عید کا دنبہ! اور دنبے کے ساتھ اسے ایک چھوٹی سی گاڑی کا خیال آیا جو دنبے کی چکی کو اٹھانے کے لیے بنائی جاتی ہے، اور پھر خود بخود اس نے اپنے بچے کے متعلق سوچا جو گاڑی میں بیٹھنے کا بڑا شوقین تھا۔ شام تک وہ بچہ اپنے باپ کے پیچھے بیٹھا علی الترتیب روتا اور ہنستا رہا تھا۔ لیکن مراری کو نہ اس کے منہ کا پتا تھا نہ رونے کا۔

شام کو مراری جین نے دکان بڑھائی، جب چادر کو بھاڑا اور سب سامان کو لپیٹ کر گاڑی میں رکھا، اُسے اپنی چھائی فراخ محسوس ہوئی جیسے ورزش کے بعد پہلوان اپنے پٹھوں کو دیکھتا ہے۔ اس نے اپنی طرف دیکھا، بچے کو پیار کیا۔ پہلے غور سے سراونچا کیا پھر انکسار کا ایک لطیف سا جذبہ اس پر طاری ہوا، اور اس نے کہا، یہ سب بھگوان مہاویر کی دیا ہے، جس نے صبح مجھے اپنی محبت کا پیغام بھیجا ہے

دوسرے دن عرس نہیں تھا۔ مراری کو زیادہ آمدن نہ ہوئی۔ صرف اتنی ہوئی جتنی عام طور پر ہوا کرتی تھی۔ . . . مراری کی خواہش تھی کہ شاید نٹھو ادھر آجائے شاید پونکھا والی بات چھوٹی ہو۔ لیکن ایک دفعہ تو اور



”یار جس کے لیے میں نے گیا تھا، اسے پسند نہیں“  
 ”کسے پسند نہیں؟“ — مرادی جین نے ننھو کو آنکھ مارے ہوئے  
 بوجھا۔

”کیا جانہ ہے! ننھو نے خفیف ہوتے ہوئے کہا: ”آجکل محبت بھی  
 نکلے پاؤ بکتے لگی ہے۔ کوئی دن تھے، لوگ قول پر مرا کرتے تھے... آج  
 کسی عورت کو نگد نار این دکھاؤ، رام کر لو!“

مرادی نے ننھو سے اتفاق کیا۔ ”بابا آج گھر میں ہاتھ  
 لٹکائے جانا کس مرد کی ہمت ہے“... بہت کچھ ادم ادم کی ہونے  
 کے بعد ننھو نے مطلب کی بات بیان کی۔ اسے اب دو لڑی نہیں بیچ لڑی  
 چاہیے تھی، اور وہ بھی موجودہ لڑی سے وزنی، جو دیکھنے میں اصلی موتیوں  
 اور اصلی دانت کی دکھائی دے۔ امی ٹیشن اور بجلی مسالے کی نہیں۔ لڑی  
 موتیوں کی ہو لیکن اس میں باگھر، چیتے، یا لومڑی لٹک رہے ہوں۔ یہی  
 اس کی مجبورہ کا تقاضا تھا۔ کس آسانی سے ننھو اور ننھو سے لڑی کی محبت  
 پیدا ہو جاتی تھی۔ اس لیے ننھو کا محبت کے تقاضوں کا بڑا ماننا عبث تھا۔  
 ”ننھو نے کہا: ”لیکن میرے پاس دام نہیں، کہے دیتا ہوں“

مرادی جین سوچنے کے لیے رک گیا، اس وقت وہ ڈبے کچھ اس  
 ترتیب سے رکھ رہا تھا کہ تمام چیزیں ایک ہی نظر میں دکھائی دے  
 جائیں۔ ایک ڈبے کو پکڑتے ہوئے اس نے کہا: ”تم جانتے ہو، بوہنی  
 کے وقت کون سور کھ ڈکندار ہے جو ادھار کرتا ہے۔“

ننھو نے کہا: ”ایک اٹھنی تمہیں دے سکتا ہوں۔“ اور دو لڑی“  
 ”مرادی نے پھر سوچا اور کہا: ”ادھار ہی تو ہوا“

یہ بالکل ادھار تو نہ ہوا۔

”لاؤ لیکن باقی پیسے جلد چکا دینا۔“

”نتھو نے ہنستے ہوئے کہا: ”میرا پونگھا کیا مفت میں آتا ہے؟“۔۔۔۔

اور چل دیا۔

اس دن قسم کھانے کو کوئی گاہک نہ آیا شہر میں کچھ جلسہ جلوس تھا

جس کی وجہ سے عورتیں اندر ہی پڑ رہی تھی۔ مراری سر دھن رہا تھا۔۔۔

بکو اس ہے۔ سب پونگھا دونگھا بکو اس ہے۔۔۔۔ عورتوں کے لیے صرف

عورتوں کے لیے جو دکن داری کرتا ہے، گھائے میں رہتا ہے۔ سالیاں جب

جی چاہے اندر پڑ رہیں ان کے مرد بھی تو خریدنے نہیں آتے۔ دنیا میں دکھانے

کی محبت بھی نہیں رہی۔ سب سے بڑا نقصان یہ کہ عورتوں کے لیے دکن داری

کرنے والا پھر مردوں کے ہاتھ کچھ بیچنے کے قابل ہی نہیں رہتا۔ اسے اس

بات کا لٹکا لگ جاتا ہے۔۔۔۔ اور مراری جین ہنسنے لگا۔۔۔۔۔ لیکن

سب سے بڑا ڈھکوسلا یہ پونگھا ہے۔۔۔۔۔ اس دن شام کوتا بے کی لاٹھ

والا ڈنڈا پکڑے ہوئے سپا ہٹا آیا۔ مراری نے بقول نتھو تنگا ہونے کی کوشش

کی لیکن نتھو نتھو تھا۔ اور مراری مراری۔ سپا ہٹے نے آنکھیں دکھاتے ہوئے

کہا: ”دو ہفتے سے میں تیرا منہ دیکھ رہا ہوں۔۔۔۔ اگر تو یہاں سے نہ گیا

تو مجھ سا بڑا کوئی نہ ہوگا۔۔۔“ مراری نے ایک دم لمبا سا منہ نکال لیا۔

اب وہ کہاں جائے گا۔ سانسے واچ میکر کے ساتھ۔۔۔۔ وہاں بھی

وہی حال ہوگا۔ دو دن کے بعد پھر دکان دار تے گا۔۔۔۔۔ مراری روٹکھا سا ہو گیا۔

شام کے قریب ایک بوڑھا آدمی مراری جین کا دکان کے سامنے

کھڑا ہوا۔ مراری اس وقت دکان بڑھا کر چادر چھانٹ رہا تھا۔ بوڑھا ایک

پل کے لیے کھڑا ہوا۔ پھر اس نے دونوں ہاتھ اوپر اٹھائے اور بے تحاشا رونا پینا شروع کیا "میرے بیٹے تو مجھے بھی ساتھ لے جاتا۔۔۔ بازار کے لوگ اکٹھے ہو گئے وہ سب بوڑھے کے ساتھ افسوس کرنے لگے۔ مراری گم سم کھڑا رہ گیا۔ وہ بیک وقت رونا، اور ہنسنا چاہتا تھا۔ اس دکان کا مالک پتہ لوک سدھا رہ گیا تھا۔ جگر کے پھوڑے کی وجہ سے دو مہینے بیمار رہ کر آخر مر گیا۔ اب مراری دکان لے سکے گا۔۔۔ خرابی میں اس کی تعمیر کی صورت مضرتھی۔۔۔ یہ کیوں تھا، کس لیے۔۔۔؟ مراری جین نے سوچا۔۔۔ یہ سب نتھو قلی کے پونکھے کی وجہ سے تھا۔

دکان لینے اور سپاہٹے کے خوف سے فارغ ہونے کے بعد پہلے مراری جین نتھو سے ملنے کے لیے اسٹیشن پر گیا۔ مراری خوش تھا، اپنے کپڑوں سے باہر ہو رہا تھا۔ عام کیفیت میں شاید وہ نتھو پر ظاہر نہ ہونے دیتا کہ وہ کس کام کی وجہ سے اس کے پاس آیا ہے۔ وہ کہہ دیتا، بھائی میں اعظم آباد سے واپس آ رہا ہوں۔ خیال آیا راستے میں تمہیں ملتا چلوں۔ لیکن اب وہ اپنی خوشی کو دبا نہیں سکتا تھا۔ دکان مل گئی۔ اور پھر ان دونوں سستے کرائے پر۔۔۔ نتھو کا پتا چلا وہ چھ نمبر پلیٹ فارم پر شملہ کالکا کی سواریاں لے رہا ہے۔ مراری جین جب وہاں پہنچا تو اس نے دیکھا نتھو ایک بڑے سے بکس کو اٹھانے کی بے سود کوشش میں ہف ہف کر رہا ہے۔ اگر وہ خود بیٹھتا ہے اور دوسرے قلی اس کی پیٹھ پر بکس رکھ دیتے ہیں تو وہ اٹھ نہیں سکتا۔ اگر وہ کھڑا ہوتا ہے تو دوسرے لوگ بکس کو اس کی پیٹھ تک اٹھا نہیں سکتے۔ اتنے بڑے پیٹ کی دھونکنی چلنے سے مراری جین کے



دیکھتے دیکھتے نٹھو کے ناک سے پھا پانکل کر ڈور گر پڑا، اور اس کے چہرے پر دو خوفناک سے سوراخ نظر آنے لگے۔۔۔۔ اور ان میں سے خون کے قطرے ٹپکنے لگے نٹھو نے دوڑ کر پھا پانکل پکڑا، اور ناک پر رکھنے کی کوشش کی لیکن وہ سوراخ کے اندر چلا گیا، اور کچھ دیر بعد خون ناک کی سطح پر نظر آنے لگا۔۔۔۔ نٹھو خون کو دیکھ کر بچوں کی طرح ڈر گیا بکس کے صاحب چلا رہے تھے۔۔۔۔ "یو ڈرٹی ڈاگ۔۔۔۔ اٹھاؤ۔۔۔۔ اٹھاؤ"

مراری جین نے نٹھو کو بلا یا۔۔۔۔ "نٹھو بھیا!"

نٹھو نے بکس چھوڑ دیا اور دوڑ کر مراری جین سے لپٹ گیا، اور پھر اس نے رونے کے لیے سمنہ چھپا لیا اور بولا۔۔۔۔ "مراری میں مر جاؤں گا۔۔۔۔ وہ ابھی تک ہانپ رہا تھا۔"

کچھ دیر کے بعد نٹھو نے ہف ہف کرنا بند کیا تو بولا۔۔۔۔ "میں اب کام نہیں کروں گا۔ میں اب بہت بوجھل بہت موٹا ہو گیا ہوں۔۔۔۔ میں بھوکا مروں گا" اور مراری نے کہا "میں اسی لیے تمہارے پاس آیا ہوں میں تمہاری یہ دشمنی دیکھ سکتا۔۔۔۔ مجھے دکان مل گئی ہے"۔۔۔۔ "دکان مل گئی ہے؟ نٹھو نے سنبھلتے ہوئے کہا۔"

اس کے بعد دونوں تھوڑی دیر کے لیے چپ رہے پھر مراری بولا۔۔۔۔ "سب تمہارے پونکھے کے کارن ہے۔۔۔۔ ورنہ ہم تو ہیں ہی سبز قدمے"۔۔۔۔ نٹھو نے جی میں خوش ہوتے ہوئے رسما انکسار کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔۔۔۔ "وہ تو میں تمہیں بنا رہا تھا مراری۔۔۔۔ یہ سب کچھ ایشور

کی دیا سے ہوتا ہے، انسان بھلا کیا کر سکتا ہے"۔۔۔۔ اس وقت کچھ لوگ بھیڑوں کے گلے کی طرح ادھر دھکیل دیے گئے تھے۔ وہ لوگ دھما دم

پتل پر سے اتر رہے تھے۔ گاڑی وِسل دے چکی تھی اور دونوں اس کی طرف متوجہ تھے۔ اچانک مراری کو اپنا کام یاد آیا۔۔۔۔۔ وہ بولا "میں تو ان باتوں میں بڑا یقین رکھتا ہوں۔۔۔۔۔ جو آدمی تمہارا راستہ کاٹ جاتا ہے وہ تم سے کچھ لے جاتا ہے یا اپنے مقدر کا کچھ حصہ تمہاری نذر کر جاتا ہے۔ پھر مراری جین نے کہا۔۔۔۔۔ "تم اپنے چرن تو ڈالو دکان میں۔۔۔۔۔" "چلا جاؤں گا، چرن ڈالنے سے کیا بگڑتا ہے؟۔۔۔۔۔ لیکن بھتیجا میں یہاں کام نہیں کر سکتا۔ میں کہیں بھی کچھ نہیں کر سکتا۔ اب میرے بڑے دن آگئے۔"

مراری جین نے دلاسا دیتے ہوئے نتھو کو کہا "تم ہو سکتے تو چھوٹا موٹا کام کر دینا۔۔۔۔۔ اور نہیں تو دکان میں پڑے رہنا۔" نتھو کی آنکھوں میں چمک پیدا ہوئی۔ اسی طرح کی چمک جو ان دونوں کی ملاقات کے روز مراری کی آنکھوں میں پیدا ہوئی تھی۔ جب سپاہنا بنا کچھ کہے سننے دکان کے سامنے سے گزر گیا تھا۔

اب نتھو دن رات دکان پر رہتا تھا۔ وہ کوئی کام نہ کرنے سے اور موٹا ہو رہا تھا۔ دکان پر پڑے ہوئے نتھو کے خراٹے چیل ہٹے اور چوک مولا واد تک سننے جاتے تھے۔ نتھو مختار تھا۔ صبح کے وقت پونچھ کے لیے دکان پر ضرور ہوتا۔ لیکن جب اس کا جی چاہتا دن کے وقت سیاحت کے لیے نکل جاتا۔ اس کے نشے، اس کی تمام بھری مادوں کا کفیل مراری جین تھا۔۔۔۔۔

مراری کی دکان پھل نکلی تھی۔ اب وہ سوچتا تھا اس نے ناحق

اس سٹنڈے کو پال رکھا ہے۔ جو اس کے سارے کینے جتنا کھا جاتا ہے سو بچوں پر تاؤ دیتا ہے اور پڑ رہتا ہے۔ لیکن جس دن مراری کو آمدن زیادہ ہوتی وہ پھر اپنے دیوتا کی پرستش کرنے لگتا وہ اسے دیکھتا تھا اور حیران ہوتا تھا۔

— یہ کون ہے — کیا ہے — کیوں ہے ؟

اب مراری نے دکان میں اور بھی متفرقات ڈال لیے تھے۔ لیکن بہت سی نئی چیزوں کو نتھو اپنی محبوبہ کے لیے مانگ لیتا تھا وہ جراتا نہیں تھا لیکن حسن طلب ایسا تھا کہ مراری کو دیتے ہی بنتی تھی، مراری کسی چیز کو دے دینے کے بعد ہمیشہ تاسف سے منہ لٹکا دیتا۔ لیکن اسے اس بات کا کوئی حل نہیں سو جھٹا تھا آمدنی تو اپنے آپ ہی ہو رہی تھی۔ یہ نتھو کو مستقل طور پر یہاں لے آنا محض حماقت تھی، اور وہ سب کچھ اپنے زور بازو سے کماتا تھا۔ اور نتھو مفت کی کھاتا — چھوٹی موٹی چیزیں۔ کلابتون، پیمک ویمک۔ ہار وغیرہ وہ یوں لے جاتا جیسے اسے ہر طرح کا حق ہے۔ مراری جین نے اپنی بیوی تک کو دکان سے کوئی چیز نہیں دی تھی۔ لیکن نتھو سب کچھ دعوے سے لے لیتا تھا۔ وہ بیکار ہو کر سست ہو رہا تھا اور سست ہو کر اور بھی بے کار۔

ایک دن دکان پر ایک بیگم آئیں۔ انھوں نے دو تین مرتبہ اس انداز سے نتھو کی طرف دیکھا جیسے کہہ رہی ہوں یہ کون شہدا یہاں بٹھا رکھا ہے جس دکان میں عورتیں آئیں، اس میں ایسے مزدوروں کا کیا کام؟ مراری نے گھورتے ہوئے نتھو کو منع کیا۔ لیکن نتھو کہاں ماننے والا تھا۔ اس سے پہلے وہ کبھی دکان میں دلچسپی نہیں لیتا تھا۔ لیکن اس وقت وہ اٹھ کر بیگم کے سامنے آکھڑا ہوا اور بولا۔

”یہ بیٹی آپ کے رنگ پر خوب کھلے گی۔“ — واہ، واہ، واہ۔“

اور بیگم خوب لال چقدر ہوئیں۔ مراری جین نے بیگم کو بتایا کہ یہ میرا بڑا بھائی ہے اور سیدھا سادا آدمی ہے۔ تب جا کر کہیں بات رفع دفع ہوئی۔ لیکن معاملہ بس اسی پر نہیں ہوا۔ اگلے روز ایک سردار نے صبا حبہ تشریف لائیں۔ انھیں کوئی چیز دکھانے کے لیے حضرت بھی تشریف لے آئے اور بولے۔۔۔ اگر آپ اسے پہنیں گی تو سردار جی بہت خوش ہوں گے۔ سردار نے شرمائی، لجائی اور ہونٹھ نکالتے ہوئے بولی۔۔۔ "رنڈی چھڑنا۔۔۔ (رانڈ چھوڑے)۔۔۔" اور پھر دوسری عورتوں کے ساتھ سیننے لگی۔ اب مراری کیا کر سکتا تھا۔۔۔ وہ ننھو سے تنگ آچکا تھا۔ لیکن باقاعدہ مزاحمت کی اسے بھی جرات نہ ہوئی۔ آخر ایک دن ننھو مراری جین کے پیسوں ہی سے ایک پیالہ خرید کر لاتا ہوا دکھائی دیا۔

"اس میں کیا ہے؟ مراری جین نے پوچھا۔"

ننھو نے کچھ جھپٹتے اور کچھ دیدہ دلیری سے کہا۔۔۔ "فسٹ کلاس ٹکٹے ہیں۔" مراری جین نہیں جانتا تھا یہ ٹکٹے کیا بنا ہوتی ہے۔ لیکن جب اس نے جھک کر دیکھا تو اسے کباب ٹکٹے اور گوشت کی کچھ بوٹیاں دکھائی دیں۔ مراری جین اس بات کو کبھی برداشت نہیں کر سکتا تھا کہ اس کی دکان میں گوشت آئے وہ مہاویر کا بھاری تھا۔ اس کے گورو ابھی تک ناک پر ایک سفید پتی رکھ کر آتے تھے۔ ان کے ہاتھ میں ایک جھاڑو سا ہوتا تھا اور جب کوئی کھانا نہیں اپنے راستے پر نظر آتا تو اسے اس کی مدد سے ہٹا دیتے۔ وہ پانی بھی چھان کر پیتے تھے۔ ایسا ان کا پریم دھرم تھا۔۔۔ مراری جین غصہ سے کانپنے لگا۔ اس نے ننھو کو قریب آنے دیا تاکہ ایک ہی ٹھوک سے پیالہ کو گرائے۔ لیکن وہ اپنے پاؤں سے بھی اس پیالہ کو چھونا نہیں چاہتا تھا۔۔۔

غصہ سے کانپتے ہوئے اس نے کہا۔  
 ”چلے جاؤ نتھو۔۔۔ آج سے میرا تمہارا کوئی تعلق نہیں۔۔۔ سنا؟  
 نتھو نے آنکھیں اوپر اٹھائیں، جھپکائیں۔ خفیف سی ہنسی ہنسا، گویا  
 مذاق کر رہا ہے۔ لیکن مراری جین کے خدو خال بگڑے ہوئے تھے۔  
 ”نکل جاؤ۔۔۔ مشنڈے۔۔۔ میں ایک پل کے لیے بھی تمہیں  
 یہاں دیکھنا نہیں چاہتا، سمجھے؟ چلے جاؤ نہیں تو پولیس کے حوالے کر دوں  
 گا۔“

نتھو نے پھر مراری جین کی طرف دیکھا۔ لیکن اسے اپنے کیے پر ذرا تاسف  
 نہ ہوا۔

نتھو جانتا تھا کہ وہ اب کسی بھی کام کے قابل نہیں رہا۔ بالکل بے کار  
 ہے، لیکن اس نے نتھو کی دھمکی نہ سہی۔۔۔ ”تم سمجھتے ہو میرا خدا مر گیا ہے؟“  
 اور نتھو سا ہنسنے والا چ میکر کے ساتھ خالی بڑا ہاؤس پر بیٹھ کر کھانے لگا۔  
 کھانے کے بعد اس نے کنوئیں کی ٹوٹی سے پانی پیا، اور مراری جین کی  
 دکان کے مقابل کھڑا ہو کر بولا۔۔۔ ”تمہاری دکان میں جو کچھ دکھائی  
 دے رہا ہے، یہ سب میری بدولت ہے۔ اب دیکھوں گا تم کیسے پھولتے پھلتے  
 ہو؟“

مراری جین نے بظاہر بے اعتنائی کا اظہار کیا۔ لیکن وہ جو پہلے غم و  
 غصے سے کانپ رہا تھا اب خوف سے کانپنے لگا۔

چند دنوں کے بعد پھر تین چار کانسیبل، ایک سولدار کی نگرانی میں ادھر  
 ادھر ٹہلنے لگے۔ کوئی دکاندار کنٹرول نرخ سے زیادہ قیمت پر چیزیں نہیں بیچ

سکتا تھا۔ لیکن مرادی جین نے خود چیزیں چور بازار سے خریدی تھیں۔ وہ  
کیسے کوئی چیز ازاں دے دیتا۔ آخر ایک دن سپا ہٹا آیا اور بولا۔  
حولداری پوچھتے ہیں تمہارے پاس بیس فیٹہ ہے؟

مرادی جین بالکل گھبرا گیا۔ اُسے پھر آسمان نیچے اور زمین اوپر نظر  
آنے لگی اس کا بچہ داخل کا ایک فراک پہننے، ایک کرسی پر بیٹھا اپنا دامن چبا  
رہا تھا۔ وہ لال پگڑی کی طرف دیکھ کر رونے لگا۔ مرادی جین کو ایک لمحہ کے  
لیے نتھویا د آیا۔ وہ ہوتا تو نوبت یہاں تک نہ آئی۔ وہ اب تکیے سے واپس نہ  
آئے گا۔ نتھو اس کا دیوتا، جو اسے ہر بلا سے محفوظ رکھتا ہے۔

سپا ہٹے کے دوبارہ سوال کرنے پر مرادی نے کہہ دیا: میرے پاس امریکن  
بیس کی دس گانٹھیں ہیں۔ اور حولداری نے چند گانٹھیں نکلوائیں، اور مقرر نرخ پر  
خرید کر بہت سی دکاؤں پر بکھیر دیں۔ قیمت خرید اور قیمت فروخت میں اتنا  
فرق تھا کہ شام تک مرادی جین اکٹھو نو سو روپے کا خسارہ اٹھا چکا تھا۔  
لیکن مرادی کو اس خسارہ کی اتنی پروا نہ تھی۔ اس کے پاس اتنے پیسے ہو گئے  
تھے کہ دو چار مرتبہ وہ اتنا خسارہ برداشت کر لیتا۔ اسے صرف دو باتوں کا  
خیال تھا۔ پہلی تو یہ کہ مال جمع کرنے کا چالان نہ ہوا، اور دوسرا خیال اسے  
نتھو کا تھا۔ وہ نہیں جانتا تھا، اس کا بیٹا ایک سفید مہل کا فراک پہنے  
رہ رہا ہے۔

اگلی صبح لوگوں نے دیکھا، مرادی جین اور نتھو پھر چیل ٹیے کی طرف سے  
آ رہے ہیں، نتھو کے ایک ہاتھ میں سلفے کی چوڑی ٹی چلم ہے۔ کندھے پر اوچھا ہے  
اور سنہ کے قریب سے ایک پیٹھرا چلم کے نیچے لٹک رہا ہے نتھو نے آکر فاتحانہ  
انداز سے سر اوپر اٹھایا اور گونے اور افشاں کے اوپر دھواں چھوڑ دیا۔



دکان میں داخل ہوتے ہوئے پھر مراری نے کہا۔  
 ”تم ناحق چھوٹی چھوٹی باتوں پر ناراض ہو جاتے ہو نتمھو؟“  
 نتمھو نے کہا ”چھوٹی بات ہے۔۔۔۔۔۔ میری پت تو اتر ہی چلی تھی؟  
 نہیں بھائی میں مور کھر ہوں، آئندہ میرے ایسے کی باتوں کا خیال نہ  
 رکھنا۔۔۔۔۔۔“ اور یہ کہتے ہوئے مراری جین نے نتمھو کے پاؤں پر ہاتھ رکھ دیے  
 اور بولا:

”بابا تو کوئی پچھلے جگ کا سادھو مہاتما ہے۔ تو سب پاپ پن سے  
 اوپر ہے۔۔۔۔۔۔ یہ جیو بھتیا مانس کھانا ہم دنیا داروں کے لیے پاپے  
 تمھارے لیے نہیں۔۔۔۔۔۔“

نتمھو نے اپنے پائیں ہاتھ سے ناک کو دبا یا۔ یہ ناک اور بھی پچک گئی  
 تھی، یہ اسی طرح پچھے گر رہی تھی جیسے پانی کے قریب کچی دیوار زمین میں بیٹھ  
 جاتی ہے۔ نتمھو نے آنے ہی طلائی بانگڑی کی فرمائش کی مراری ایک لمحہ  
 کے لیے ٹھٹکا پھر اس نے بانگڑی نتمھو کو دے دی۔

نتمھو کے آنے کے بعد دو عورتیں مراری کی مستقل گاہک بن گئی تھیں یہ  
 ایک ہی شیخ صاحب کی دو بیگمات تھیں۔ بڑی بیگم چھوٹی کو داستہ کہا کرتی تھیں  
 چھوٹی بیگم بڑی کو ابن جان کہہ کر پکارا کرتی تھیں۔ چھوٹی بیگم کے ہاتھ میں  
 نقد روپے پیسے ہوتے تھے اور وہ جتنا چاہے خرچ کر سکتی تھیں۔ لیکن بڑی  
 کو نقد پیسے نہیں دے جاتے تھے البتہ نواج کے دکانداروں کو شیخ صاحب  
 کا حکم تھا کہ بیگم جو چیز چاہیں انھیں دے دیں ہر مہینے کی یکم کو حساب چکا  
 دیا جائے گا۔ اس لیے بڑی بیگم ہند کے ساتھ چھوٹی سے زیادہ خرچ کرتی  
 تھیں۔۔۔۔۔۔

اور سراری ہین نے اپنے دو گاہکوں سے سینکڑوں روپے کمائے جس کے سامنے اس بانکڑی کی کوئی حقیقت نہ تھی۔ لوگ اب پھر نتھو کے خراٹے سنتے تھے اس سے پہلے نتھورات کو کہیں چلا جایا کرتا تھا لیکن اب اس میں چلنے کی سکت نہ تھی وہ سارا دن دکان پر پڑا رہتا، اور لوبیاں، شکر قندی اور طرح طرح کی چیزوں کی فرمائش کیا کرتا۔ سراری جین کبھی خوشی سے اور کبھی طوٹاؤ کرنا ان فرمائشوں کو پورا کرتا۔ وہ ہر روز صبح آتے ہی نتھو کے پاؤں چھوتا اور پھر کوئی کام کرتا۔ نتھو سراری ہین کا دیوتا بن گیا تھا۔

گریسوں کا موسم بند رہا۔ آمدنی خاصی تھی لیکن ختم گئی تھی۔ اس پر نتھو کی فرمائشیں ختم نہ ہوتی تھیں۔ وہ کتنا روپیا نتھو کو دے چکا تھا، ایک بات کا سراری جین کو یقین تھا نتھو چور نہیں ہے، جو لیتا ہے مانگ کر لیتا ہے۔ نتھو ب دکان میں سونے لگا تھا۔ وہ اب کہیں نہ جاتا تھا کہیں جانے کے اہل بھی نہیں تھا۔

ایک دن صبح سراری جین معمول سے جلدی دکان پر آیا تو اسے دکان سے ایک عورت نکلتی دکھائی دی سراری ہین نے لال پیلے ہوتے ہوئے کہا۔  
 "یہ کون تھی نتھو؟" نتھو نے ہنستے ہوئے کہا "تم جانو، میں اب کہیں جانے کے قابل نہیں۔ اب یہی مجھ تک آجاتی ہے۔"

"یہ ہے کون؟ سراری نے پوچھا،" وہی ہے جس کے لیے میں بانکڑی وانکڑی لے جاتا ہوں جس کی چلم نیچے میں بھرتا رہا ہوں۔"

سراری جین جی ہی جی میں روئے لگا۔ وہ کچھ دیر تک نتھو کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر کسی خیال کے آنے سے اس نے جھک کر نتھو کے پاؤں کو ہاتھ لگایا اور جھاڑن سے دکان کے شیشے صاف کرتے ہوئے بولا:

"بابا، تو پاپ پن سے پرے ہے؟"

## کو کھ جلی

گھنڈی نے زور زور سے دروازہ کھٹ کھٹایا۔  
گھنڈی کی ماں اس وقت صرف اپنے بیٹے کے انتظار میں بیٹھی تھی۔ وہ  
یہ بات اچھی طرح جانتی تھی کہ پہلے پہر کی نیند کے چوک جانے سے اب اسے سردیوں  
کی پہاڑ ایسی رات جاگ کر کاٹنا پڑے گی۔ چھت کے بیچے لا تعداد سرکنڈے گننے کے  
علاوہ ٹڈیوں کی اُداس اور پریشان کرنے والی آوازوں کو سنا ہوگا۔  
دروازے پر زور زور کی دستک کے باوجود وہ کچھ دیر کھاٹ پر بیٹھی رہی۔ اس  
لیے نہیں کہ وہ سردی میں گھنڈی کو باہر کھڑا کر کے اس کے گھر میں دیر سے آنے  
کی عادت کے خلاف آواز اٹھانا چاہتی تھی، بلکہ اس لیے کہ گھنڈی اب اسی تو گیا

-۴-

یوں بھی بوڑھی ہونے کی وجہ سے اس پر ایک قسم کا شوگر وار آکس، ایک  
بیٹھی سی بے حسی چھائی رہتی تھی۔ وہ سولے اور جاگنے کے درمیان معلق رہتی۔ کچھ  
دیر بعد ماں خانوشی سے اٹھی پھر سے اوندھی لیٹ کر اس نے اپنے پاؤں چار پائی  
سے دوسری طرف لٹکائے اور گھسیٹ کر کھڑی ہو گئی۔ شمع دان کے قریب پہنچ کر اس

نے بتی کو اونچا کیا۔ پھر واپس آکر کھاٹ کے سانگھے میں چھپائی ہوئی ہلاس کی ڈبیا نکالی اور اطمینان سے دو چٹکیاں اپنے نتھنوں رکھ کر ڈوگھرے سانس لیے اور دروازے کی طرف بڑھنے لگی۔ لیکن تیسری دستک پر یوں معلوم ہوا جیسے کواڑ ٹوٹ کر زمین پر آ رہیں گے۔

”ارے تھم جا۔ آجڑ گئے“ ماں نے برہم ہو کر کہا۔ ”مجھے انتظار دکھاتا ہے اور آپ ایک پل بھی تو نہیں ٹھہر سکتا“

کواڑ کے باہر گھنڈی کے کالوں پر لپٹے ہوئے منظر کو چیرتے ہوئے ماں کے یہ الفاظ گھنڈی کے کالوں میں پہنچے۔ ”آجڑ گئے...“ ماں کی یہ گالی گھنڈی کو بہت پسند تھی۔ ماں اپنے بیٹے کے بیاہ کا تذکرہ کرتی اور بیٹا بظاہر بے اعتنائی کا اظہار کرتا جب بھی وہ یہی گالی دیتی تھی۔ ایک پل میں گھر کو بسا دینے اور اُجاڑ دینے کا ماں کو خاص ملکہ تھا۔

اس طور پر اتنا دے ہونے کا گھنڈی کو ٹوڈ بھی افسوس ہوا۔ اس نے منظر سے اپنے کان اچھی طرح ڈھانپ لیے اور جیب سے چرائے ہوئے میکر و پو لو کا ٹکڑا سلگا کر کھڑا ہو گیا۔ شاید آگ سے قریب ہونے کا احساس اُسے بے پناہ سردی سے بچالے۔ پھر وہ میکر و پو لو کو ہوا میں گھا کر کنڈل بنانے لگا۔ یہ گھنڈی کا محبوب مشغلہ تھا جس سے اس کی ماں اُسے ”اوگن“ بتایا کرتی تھی۔ لیکن اس وقت کنڈل سے نہ صرف اُسے تسکین ملحوظ خاطر تھی، بلکہ ماں کے ان پیارے الفاظ کے خلاف ایک چھوٹی سی غیر محسوس بغاوت بھی۔

سگریٹ کا آوارہ جگنو ہوا میں گھومتا رہا۔ گھنڈی اب ایک اور دستک دینا چاہتا تھا لیکن اُسے خود ہی اپنی احمقانہ حرکت پر ہنسی آگئی۔ وہ لوگ بھی کتنے احمق ہوتے ہیں۔ اس نے کہا، جو ہر مناسب اور نامناسب جگہ اپنا وقت

ضائع کرنے رہتے ہیں۔ لیکن جب انہیں کسی جگہ پہنچنا ہوتا ہے تو وقت کی ساری کسر سائیکل کے تیز چلانے، یا بھاگ بھاگ کر جان ہلکان کرنے میں لگا دیتے ہیں۔ اور یہ سوچتے ہوئے گھنڈی نے سگریٹ کا ایک کش لگایا اور دروازہ کے ایک طرف نالی کے قریب دبک گیا۔

دھویوں کی کڑھی میں اُگا ہوا گوندی کا درخت پچھوا کے سامنے جھک گیا تھا۔ جھکاؤ کی طرف، ٹہنیوں میں چاند کی ہلکی سی پھانک اُلچی ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔ ماں نے ضرور آج گلے میں دوپٹہ ڈال کر دوپٹے کی پھوکیں ایکم کے چاند کی طرف پھینکے ہوں گے۔ اس کے بعد ایک ایسی سائیں سائیں کی بھیانک سی آواز بلند ہوئی۔ ہوا، چاند کی پھانک اور گوندی کا درخت مل جل کر اُسے ڈرانے والے ہی تھے کہ ماں نے دروازہ کھول دیا۔ . . . .

”ماں . . . . .“ گھنڈی نے کہا اور خود دروازے سے ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔ اس سے ایک لمحہ پہلے وہ اپنے دانٹوں کو بچھڑ رہا تھا۔

”آجا۔۔۔“ ماں نے پکڑ رکھائی سے کہا، اور پھر بولی۔ ”آجا بھی اب ڈرتا کیوں ہے۔ تیرا کیا خیال ہے، مجھے پتا نہیں چلے گا؟“

گھنڈی کو ایک معمولی سا خیال آیا کہ ماں کے منہ میں ایک بھی دانٹ نہیں ہے لیکن اس نے اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے کہا۔

”کس بات کا پتا نہیں چلے گا؟“

”ہوں۔۔۔“ ماں نے دیے کی بے بضاعت روشنی میں سر ہلاتے اور

چڑاتے ہوئے کہا: ”کس کا پتا نہیں چلے گا۔ . . .“

گھنڈی کو پتا چل گیا کہ ماں سے کسی بات کا چھپانا عبت ہے۔ ماں۔

جو چوبیس سال ایک شرابی کی بیوی رہی ہے۔ . . . گھنڈی کا باپ جب بھی

دروازے پر دستک دیا کرتا، ماں فوراً جان لیتی کہ آج اس کے مردنے پی رکھی ہے۔ بلکہ دستک سے اُسے پینے کی مقدار کا بھی اندازہ ہو جاتا تھا۔ پھر گھنڈی کا باپ بھی اسی طرح دیکے ہوئے داخل ہوتا۔ اسی طرح پچھوا کے شور کو شرمندہ کرتے ہوئے..... اور یہی کوشش کرتا کہ چپکے سے سو جائے اور اس کی عورت کو پتا نہ چلے..... لیکن..... لیکن..... شراب کے متعلق گھنڈی کے ماں باپ میں ایک آن لکھا اور آن کہا سمجھوتہ تھا۔ دونوں ایک دوسرے کو آنکھوں ہی آنکھوں میں سمجھ جاتے تھے۔ پینے کے بعد گھنڈی کا باپ ایک بھی وا فر لفظ منہ سے نہ نکالتا اور اس کی ماں اپنے مرد کو پینے کے متعلق کچھ بھی نہ جتاتی وہ چپکے سے کھانا نکال کر اس کے سرہانے رکھ دیتی اور سونے سے پہلے معمول کے خلاف پانی کا ایک بڑا کٹورہ چار پائی کے بیچے رکھ کر ڈھانپ دیتی..... صبح ہوتے ہی اپنے پلو سے ایک آدھ سکا کھول کر گھنڈی کی طرف پھینک دیتی اور کہتی:

”لے۔ ادھ بلویا لے آ۔“

اور گھنڈی اپنے باپ کے لیے شکر ڈلو کر آدھ بلویا دہی لے آتا جیسے پی کر وہ خوشی ہوگا، روٹنا، لو تیرہ کرنا اور پھر ”ہاتھ سے جنت نہ گئی“ کو جھلاتا... گھنڈی نے ماں کے منہ سے یہ بات سنی اور خفت کی ہنسی ہنس کر بولا:

”ماں..... ماں! تو کتنی اچھی ہے..... پھر گھنڈی کو ایک چکر آیا۔ شراب پچھوا کے جھونکوں سے اور بھی پڑا اثر ہو گئی تھی۔ سگریٹ کا جگنو جو اپنی فاسفورس کھو چکا تھا، دور پھینک دیا گیا، اور ماں کا دامن پکڑتے ہوئے گھنڈی بولا: ”اور لوگوں کی ماں ان کی بیوی ہوتی ہے لیکن تو میری ماں ہی ماں ہے۔“

اور دونوں مل کر اس احمقانہ فقرے پر ہنسنے لگے۔ دراصل اس چھوکرے

کے ذہن میں بیوی کا نقشہ مختلف تھا۔ گھنڈی سمجھتا تھا بیوی وہ عورت ہوتی ہے جو شراب پی کر گھر آئے ہوئے خاوند کی جوتوں سے تواضع کرتی ہے۔ کم از کم رولنگ ملز کے مستری کی بیوی جس کے تحت گھنڈی شاگرد تھا اپنے شرابی شوہر سے ایسا ہی سلوک کیا کرتی تھی۔ اور اس قسم کے جوتی پزار کے قصے آئے دن سننے میں آتے تھے۔ پھر کوئی ماں بھی اپنے بیٹے کو اس قسم کی حرکت کرتے دیکھ کر اچھا سلوک نہیں کرتی تھی۔ بخلاف ان کے گھنڈی کی ماں ماں تھی۔ ایک وسیع و عریض دل کے مترادف جس کے دل کی پہنائیوں میں سب گناہ چھپ جاتے تھے۔۔۔۔ اور اگر گھنڈی کے اس بظاہر احمقانہ فقرے کی اندرونی صحت کو تسلیم کر لیا جائے تو اس کی متناقض شکل میں گھنڈی کی ماں اپنے شوہر کی بھی ماں تھی۔

بستر پر دھم سے بیٹھتے ہوئے گھنڈی نے اپنے ربڑ کے جوتے اتارے یہ جوتے سردیوں میں برف اور گرمیوں میں انگارہ ہو جاتے تھے۔ لیکن ان جوتوں کو پہننے ہوئے کون کہہ سکتا تھا کہ گھنڈی ننگے پاؤں گھوم رہا ہے۔۔۔۔ گھنڈی نے ہمیشہ کی طرح جوتے اتار کر گرم کرنے کے لیے چولھے پر رکھ دیے۔ ماں پھر چلائی۔

"یہ میرے تیری ماں بھگوان کرے سے۔۔۔۔ ہے۔۔۔ گور بھوگ

لے تو کو۔"

لیکن ہندو دھرم بھر شٹ ہوتا رہتا۔ ماں جوتے اتار کر دور کونے میں پھینک دیتی۔ پھر بکتی جھکتی اپنے دامن میں ایک جوتی باندھ گھنڈی کے سر ہانے پانی کا ایک بڑا سا کٹورہ رکھ، متعفن بستر کی آتوں میں جا دکتی۔



حد ہو گئی۔۔۔ ماں نے دو تین مرتبہ سوچا۔ گھمنڈی نے بنواری اور  
 رسید کی سنگت چھوڑ دی ہے۔ اس نے گھمنڈی کو شراب پینے سے منع بھی نہیں  
 کیا اور نہ اپنے اوباش سنگی سنگاتی کے ساتھ گھومنے سے۔۔۔ ماں نے سوچا  
 شاید یہ نرمی کے برتاؤ کا اثر ہے۔ لیکن وہ ڈر گئی اور جلد جلد ہلاس کی چٹکیاں  
 اپنے نتھنوں میں رکھنے لگی۔ اپنے آپ کو مارنے کا اس کے پاس ایک ہی ذریعہ  
 تھا۔ ہلاس سے اپنے پھیپھڑوں کو چھلنی کر دینا۔۔۔ لیکن اب ہلاس کا کوئی بھی  
 اثر نہیں ہوتا تھا۔۔۔ اسی نرمی سے ماں نے اپنے شوہر کا منہ بھی بند کر دیا تھا  
 اس کی شخصیت کو کچل دیا تھا اور وہ بے چارہ کبھی اپنی عورت کی طرف  
 آنکھ بھی نہیں اٹھا سکتا تھا۔ اسی طرح گھمنڈی بھی اپنی ماں کے ساتھ ہم کلام  
 ہونے سے گھبراتا تھا۔ ماں نے اس بات کو محسوس کیا اور پھر وہی۔۔۔  
 ”تیری ماں مرے بھگوان کرے سے۔۔۔ لیکن اس بات کا اسے کوئی حل  
 نہ سوچھ سکا۔“

آج پھر چھ بجے شام گھمنڈی کا رخا نے سے لوٹ آیا۔ حالانکہ وہ نٹھوا  
 چوکیدار کی آواز کے ساتھ محلے میں داخل ہوتا تھا۔ اس سے پہلے وہ کوئی پرانی  
 تصویر دیکھنے چلا جاتا۔ وادیا کی مس ناریا کے گیت گاتا اور ایک دو سال  
 سے اس کے پراسرار طریقے سے غائب ہو جانے کے متعلق سوچتا۔۔۔۔۔  
 آج پھر اتنی جلدی لوٹ آنے سے ماں کے دل میں وسوسے پیدا ہوئے۔۔۔  
 ”اس نے بیکار ایک کام پیدا کرتے ہوئے کہا۔۔۔“

”سے تو بیٹا۔۔۔ زیرہ سے آتھوڑا۔۔۔“

”زیرہ؟ گھمنڈی نے پوچھا۔ وہی کے لیے ماں؟“

”اور تو کا تمہارے سر پہ ڈالوں گی“ ماں نے لاڈ سے کہا اور ضرورت سے

دافر پیسے دیتی ہوئی بولی: "لو یہ پیسے ٹھیٹر دیکھنا"  
 "میں سینما نہیں جاؤں گا ماں: گھنڈی نے سر ہلاتے ہوئے کہا: "یہی سیر  
 تما ثنا تو ہم لوگوں کو خراب کرتا ہے"

ماں حیران ہو کر اپنے بیٹے کا منہ تکلنے لگی۔ ابھی خیر سے ہاتھ پاؤ بھی نہیں  
 کھلے: اتنی دانش کی باتیں کرنے سے بخر لگ جائے گی رے.... اور دراصل  
 وہ اپنے بیٹے کو ایک شرابی دیکھنا چاہتی تھی۔ نہیں شرابی نہیں، شرابی سے کچھ کم  
 جس سے تباہ حال نہ ہو جائے کوئی۔ لیکن یہ بھل منسیت بھی ماں کو اس نہ آتی  
 تھی۔ اس نے کئی عقل مند بچے دیکھے تھے جو اپنی عمر کے لحاظ سے زیادہ عقلندی  
 کی باتیں کرتے تھے اور انھیں ایشور نے اپنے پاس بلا لیا تھا۔

گھنڈی زیرہ لانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ پیسے لے کر دروازے تک  
 پہنچا۔ مشکوک نگاہوں سے اس نے دروازہ کے باہر جھانکا۔ ایک قدم باہر رکھا  
 پھر پیچھے کی جانب کھینچ لیا اور لولا: "باہر چچی کھڑی ہے اور منشی بھی ہے"  
 "تو پھر کا؟" ماں نے تیوریوں کا ترشول بناتے ہوئے کہا:

"پھر کچھ ہے" گھنڈی بولا "میں ان کے سامنے باہر نہیں جاؤں گا"  
 ماں نے سمجھاتے ہوئے کہا "تو نے منشی کا کتھا اتار لیا ہے، جو باہر نہیں  
 جاتا؟"

لیکن گھنڈی باہر نہیں گیا۔ ماں منہ میں دوپٹہ ڈال کر کھڑی ہو گئی ماں  
 منہ میں دوپٹہ اس وقت ڈالا کرتی تھی جب کہ وہ نہایت پریشان یا حیران  
 ہوتی تھی۔ اور اپنے کیلجے میں سگہ اس وقت مارا کرتی تھی جب کہ بہت غلگین  
 ہوتی.... اس سے پہلے تو گھنڈی کسی سے شرمایا نہیں تھا۔ وہ تو محلے کی  
 لونڈیوں میں ڈنڈ پیلاتا تھا۔ غوروتوں کے کولھوں پر سے بچے چھین لیتا اور

انہیں کھلاتا پھرتا۔ اور اسی اثنا میں عورتیں گھر کا دھندا کر لیتیں اور گھنڈی کو دعائیں دیتیں۔۔۔۔۔ اور آج وہ منشی اور بچی سے بھی جھیننے لگا تھا۔

گھنڈی نے واپس آتے ہوئے اپنے باپ کے زمانے کا خرید اہوا ایک پھٹا پڑا نا موم جامہ نیچے پچھایا، اور ایک ٹوٹا ہوا شیشہ اور رال سا سنسے رکھ کر ٹانگیں پھیلا دیں۔ ٹانگوں پر چند سخت سے پھوڑوں پر اس نے رال لگائی اور پھر شیشے کی مدد سے منہ پر رسنے والے پھوڑے سے پانی پونچھنے لگا اور پھر اس پر بھی سر ہم لگا دی۔ ماں نے اپنی دھندلی آنکھوں سے منہ والے پھوڑے کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔۔۔۔۔ ہائے، کتنا کھون کھرا اب ہو گیا ہے۔ تمہارا۔۔۔ اور پھر کر بچا اور نیم کے نسخے گنانے لگی۔

اس وقت تک بہت رات ہو گئی تھی۔ رال لگانے کے بعد گھنڈی موم جامے پر ہی دراز ہو گیا اور لیٹے ہی اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ آج ماں کو بھی جلدی سو جانے کا موقع تھا لیکن وہ اپنے موندھے پر جوں کی توں بیٹھی رہی۔ وہ جانتی تھی کہ بستر میں جا دیکھنے پر وہ نسبتاً بہتر رہے گی لیکن ایک خوشگوار تساہل نے اسے موندھے کے ساتھ جکڑے رکھا، اور وہیں سکڑتی گئی۔ اس کا بڑھا پاپا اس بیٹھی نیند کے مانند تھا جس میں پڑے ہوئے آدمی کو سردی لگتی ہو اور وہ اپنی ٹانگیں سمیٹ کر کیلجے سے لگاتا چلا جائے۔۔۔۔۔ لیکن پاپا میں پڑے ہوئے لحاف کو اٹھانے کے لیے ہل نہ سکے۔

ایکایکی ماں چونکی۔ اُسے اپنے بیٹے کی خاموشی کا پتا چل گیا تھا اس نیم خوابی میں بڑے بڑے راز کھل جاتے ہیں۔ ماں نے کیلجے میں مارنے کے لیے مکا ہوا میں اٹھایا لیکن وہ وہیں کا وہیں رک گیا اور وہ پھر ایک حسین غشی میں کھو گئی۔ لیکن اسے گھنڈی اور اس کے ساتھ اس کا باپ



عورت ماں ہے اور مرد بیٹا۔۔۔۔۔ ماں کھلاتی ہے اور بیٹا کھاتا ہے۔۔۔۔۔ ماں  
خالق ہے اور بیٹا تخلیق۔۔۔۔۔ اس وقت وہاں ماں تھی اور بیٹا۔۔۔۔۔ ماں،  
بیٹا۔۔۔۔۔ اور دنیا میں کچھ نہ تھا۔

ماں بدستور خواب اور بے خوابی کے درمیان معلق تھی۔ وہ کچھ سوچ  
رہی تھی لیکن اس کے تخیل کی شکلیں بے قاعدہ ہو کر خواب کے ایک اندھیرے  
جو ہڑ میں ڈوب رہی تھیں۔ اس کے گالوں کے چند مکان اس کی گلی میں آئے  
تھے لیکن کسی پُر اسرار طریقے سے ان مکانوں کے پیچھے بھی وہی دھو بیوں کا  
محلہ آباد تھا۔ وہاں بھی وہی بل اور گوندی کے درخت۔۔۔۔۔ ساتیں ساتیں  
کر رہے تھے۔۔۔۔۔ اما اس کی رات کا جل ہو رہی تھی اور بیٹے کا چاند ان  
نہلمتوں کو پاش پاش کر رہا تھا۔ اس کا شوہر جسے وہ غلطی سے مرا ہوا  
تصور کرتی تھی، زندہ تھا اور اس سے صبح کے وقت "ادھ بلوئے" کی  
کٹوری مانگ رہا تھا۔ اسے پیاس لگی تھی۔ ایک نہ پی ہوئی شراب کے نشے  
سے اسے بڑی طرح اعضا شکنی ہو رہی تھی لیکن اس کا خاوند تو مر چکا تھا  
مرے ہوئے آدمی کو کوئی چیز دینا گھر میں کسی اور ستفنس کو خدا کے گھر بھیج  
دینے کے مترادف ہے لیکن وہ انکار نہ کر سکی۔ وہ بیوی تھی اور ماں۔ اس  
نے اپنے شوہر کے منہ کے ساتھ لگا ہوا کٹورہ چھین لیا۔ لیکن کیوں؟ اس کا شوہر  
مرا کھوڑے ہی تھا۔ وہ سا منے کھڑا تھا۔ وہی کٹا ہوا سا ہونٹ جس میں  
سونے کے کیل والا دانت دکھائی دے رہا تھا۔ بڑی بڑی موہنچھیں بھی اس  
دانت کو ڈھانپنے سے قاصر تھیں۔

دروازے پر دستک سنائی دی اور ماں کو محسوس ہوا، جیسے کسی نے  
اسے جھنجھوڑ دیا ہو۔ اس وقت اس کی آنکھوں سے ایک غلاف سا اُترا لیکن

اس پر ایک اور غلاف تھا جو اس کے سارے بدن کا احاطہ کیے ہوئے تھا وہ پڑی رہی . . . . پڑی رہی . . . اس کے پاؤں جو کچھ دیر پہلے سرد اور لکڑی کی طرح سخت تھے، کچھ گرم ہو گئے تھے، شاید گھنڈی نے ہمیشہ کی طرح رگڑ رگڑ کر اس کے پاؤں گرم کیے تھے۔ ماں اپنے تخیل میں سنسی . . . . گھنڈی بھی اسے مرنا دیکھنا نہیں چاہتا۔ بیوی آجائے تو کچھ پتا نہیں . . . . لیکن اب اس گھن لگے ہوئے شریر کا کیا ہے؟ . . . ہلا اس کدھر گئی . . . ماں سو گئی لیکن دروازے پر دستک کی آواز برابر سنائی دے رہی تھی۔ بنواری اور رشید بھی پھر گھنڈی کو بلانے آئے تھے۔ ماں کو ایک گونہ تسکین ہوئی گھنڈی پھر ٹھیک ہو جائے گا لیکن حد گونہ اضطراب ہوا۔ ان کی سنگت پھر گھنڈی کو بگاڑ دے گی اس وقت بڑھیا کو جاگ آئی۔ جاگتے ہی پہلی بات جہاں کے ذہن میں آئی وہ اس بات کی خوشی تھی کہ اس نے گھنڈی کے باپ کو ادھر بلوائے کا کٹورہ منہ سے لگانے نہیں دیا۔ اگرچہ وہ کس قدر پیاسا تھا اور اس کا عضو عضو لوٹ رہا تھا اور وہ بڑی التجا آمیز آنکھوں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ ایک گھونٹ بھی پی چکا تھا لیکن ماں نے سمجھنا چاہا کہ اس نے کچھ نہیں پیا اور وہ سمجھ گئی۔ اس نے دروازے میں کھڑے اپنے بیٹے کی طرف دیکھا اور اس قدر دھیمی آواز میں کہا "میں صدقے لال" کہ وہ خود بھی اپنی آواز کو نہ سن سکی۔ اسی طرح اس نے ایک اُن سنا بوسہ ہوا کی لہروں میں چھوڑ دیا۔

اپنی ماں کو سوتا دیکھ کر گھنڈی باہر آ گیا اور بولا۔

"میں سینما کے علاوہ اور کہیں نہیں جاؤں گا۔ یار کہے دیتا ہوں؟"

"نکل باہر سائے۔ رشید نے گالی بکتے ہوئے کہا "نکلنا ہے یا . . . ."

ماں کے دماغ میں ٹنڈیوں اور جینگروں کی آواز دوسری آوازوں کے ساتھ برابر آرہی تھی۔ اگرچہ وہ قریب قریب سوئی ہوئی تھی، گھنڈی نے باہر سے دروازہ بند کیا اور چلا گیا۔

کسی خیال کے آنے سے ماں اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اُسے پھر اپنا شوہر یاد آیا۔ اور بیٹا جو شکل اور عادات کے لحاظ سے اپنا باپ ہو رہا تھا لیکن کم سنی اور بلوغت کے درمیان ہی تھا چند ہی دنوں میں بالغ ہو جائے گا پھر اسے لگائی کی ضرورت ہوگی۔ ماں نے دل میں کہا: مجھے پتا ہے اب گھنڈی باہر کیوں نہیں جاتا؟

ماں جانتی تھی گھنڈی اپنے باپ سے زیادہ حساس واقع ہوا ہے جب وہ پنی کر آئے تو اسے جتا دینا بڑی مور کھائی ہے۔ اور پھر اگلی صبح پلو سے جوتی کھول کر دینا بھی تو ایک چیت ہے۔ چیت۔۔۔ چپ چاپ چیت۔۔۔ شراب پی کر آئے ہوئے غاوند۔۔۔ بیٹے سے جوتی پیزار کرنا اور جوتی کھول کر دینا یا سرہانے کے قریب پانی کا کٹورہ رکھ دینا ایک ہی قسم کی بدسلوکی تو ہے۔ بلکہ یہ بات جوتی پیزار سے کہیں زیادہ دل آزار ہے اسی لیے گھنڈی کے باپ نے اس کے سامنے کبھی آنکھ نہیں اٹھائی۔۔۔۔۔ باپ میں شخصیت کو کچل دینے کی وہی تو ذمہ دار تھی اور اب بیٹے کو مار رہی ہے۔۔۔۔۔ ماں نے دل میں تمہیہ کیا کہ اب وہ کبھی اپنے پلو میں دہی کے لیے جوتی نہیں باندھے گی اور نہ مرا جی سرہانے کے قریب رکھے گی۔ اور وہ خود کڑھے گی لیکن بیٹے کو کچھ نہیں کہے گی۔۔۔۔۔ اسے یہ پتا نہیں لگے گا کہ میری ماں سب کچھ جان گئی ہے۔۔۔۔۔ گھنڈی کے باپ کا بھی خیال تھا کہ اگر گھنڈی کی ماں واویلا یا احتجاج کرتی تو اس وقت تو ضرور یہ معلوم ہوتا



لیکن آخر میں کتنی آسانی رہتی۔ پہلے تو اس حادثہ سے خلاصی ہو جاتی۔ اور اگر یہ لت رہتی بھی تو اسی قدر شرمندگی کا منہ دیکھنا پڑتا۔ اب جب کہ وہ خاموشی سے پانی کا کٹورہ سرہانے رکھ دیتی ہے اور جلدی جلدی ہلاسن نکتھوں میں ڈالتی ہے تو سارا نشہ ہرن ہو جاتا ہے۔۔۔۔ شاید گھنڈی اس تازیانے کی چوٹ نہ سہہ سکا تھا اور اس نے شراب پینا اور دیر سے گھر آنا ترک کر دیا تھا۔۔۔ خیر آج سے گھنڈی پنی کر آئے گا تو وہ کچھ نہیں سمجھے گی۔۔۔ کچھ نہیں کہے گی۔

رات کے گیارہ بجے ہوا کے جھونکوں اور گوندنی کے پتوں کے ساتھ گھنڈی بھی داخل ہوا۔ آج ہوا گھنڈی سے زیادہ شور مچا رہی تھی۔۔۔۔۔ ماں بدستور جھت کی کڑیاں گن رہی تھی اور من ہی من میں کوئی بھولا بسرا پھوڑا گا کر نیند کو بھگا رہی تھی۔ گھنڈی نے آتے ہی دونوں ہاتھوں میں پھونک ماری۔ ہاتھوں کو رگڑا اور ماں کے پاؤں تھامتے ہوئے بولا۔

”ماں۔۔۔!“

اور ماں کو جاگتے ہوئے پا کر بولا:

”ارے!۔۔۔ تو سو کیوں نہ گئی ماں؟“

ماں نے مختصر سا جواب دیا۔

”اب ان دیدوں میں نیند کہاں رہے گھنڈی!“

لیکن اس سے آگے وہ کچھ اور نہ کہہ سکی۔ گھنڈی بالکل ہوش میں باتیں کر رہا تھا۔ آج اس نے ایک قطرہ بھی تو نہیں پی تھی۔ اب تو ماں نے کچھ نہ سمجھنے کا تہیہ کیا تھا اس کا کیا ہوا!۔۔۔۔۔ ماں سچ ہی کچھ نہ سمجھ سکی۔۔۔۔۔ وہ کچھ بھی نہ جان سکی۔

پت جھڑبو ہونی تھی سو ہو چکی تھی۔ اس دفعہ پروا کے آخری جھونکے اور تو کچھ نہ لائے  
ایک مہمان لینے آئے۔ ماں نے گھنڈی کو بلا تے ہوئے کہا۔

”بیٹا! لے یہ چینی بدل یا۔“

محلے میں چینی بدلنے کی رسم خوب چلتی تھی۔ ماں بچی ہوئی سبزی بچی کے  
ہاں بھیج دیتی اور وہاں سے خالی برتن میں بچی ہوئی ترکاری آجاتی۔ اس  
تہا دلے میں بڑی بچت تھی۔ دوسری سبزی بنانے کی زحمت نہیں اٹھانا پڑتی  
تھی اور کھانے میں وہ بات پیدا ہو جاتی تھی۔ اور بچی سے چینی چلتی بھی خوب تھی  
لیکن گھنڈی نے یوں ہی کھڑے ایسا سر ہلاتے ہوئے کہہ دیا۔

”میں اب بڑا ہو گیا ہوں ماں۔ میں کہیں نہیں جانے کا۔“

”لو ایک نئی مصیبت۔“ ماں نے کہا اور خوش ہوتے ہوئے بولی ”تو بڑا

ہو گیا ہے تو کا؟“

اس وقت مہمان کہیں باہر گیا ہوا تھا۔ گھنڈی نے موم جامہ جھانگے کے  
قریب پچھا رکھا تھا اور اس پر وہی رال لگا رہا تھا۔ ان پھوڑوں کو آرام آتا  
تھا پر نہ آتا تھا۔ ماں نے دامن کی ہوا کرتے ہوئے رستے ہوئے پھوڑوں  
پر سے مکھیاں اڑائیں اور بولی ”تیرا تو کھون بالکل کھراب ہو گیا ہے۔“

اور دراصل گھنڈی کا خون شراب ہو گیا تھا۔ اس کے باپ دا دا  
نے اسے پاک پوتر خون دیا تھا لیکن بیٹے نے خون میں تیزاب ڈال دیا اور  
خون پھٹ گیا۔ جسم بھی ساتھ پھٹنے لگا۔ کچھ مجرمانہ نگاہوں سے گھنڈی نے  
اپنی ماں کی طرف دیکھا اور بولا۔ ”ماں!۔۔۔ مجھے گرمی ہو گئی۔“

ماں کے سارے تیور سوال کی صورت میں اٹھ گئے۔ اور اس نے فقط

اتنا کہا ”کاؤ؟“

گھنڈی نے جھلنگے کی لٹکتی ہوئی رسیوں کو تھامتے ہوئے کہا: یہ رشید کی کرتوت ہے! اور بے اختیار روتے ہوئے بولا: "اس میں میرا کوئی قصور نہیں ماں!

ماں نے ایک دفعہ پھر کہا: "کاؤ" اور گھنڈی کی حدت شعلہ بار ہو گئی۔ اس نے ماں کو ایک گالی دینا چاہی لیکن وہ رُک گیا۔ گھنڈی اب خود بھی چاہتا تھا کہ ماں کو اس کے آزار کا پتا چل جائے۔ بیٹے کو روتے دیکھ کر ماں ٹھٹک کر رہ گئی۔ روگ تو جی کے ساتھ لگا ہوا ہے لیکن اتنا خون خراب کبھی کسی کا نہیں ہوا۔۔۔ اور اس نے سوتے میں اپنے مرحوم خاوند کو ادھر بلو یا پلا دیا تھا۔ مجبور ہو کر گھنڈی پھر بلوغ، گمراہ بلوغ کی داستان رونے لگا۔ آج

سے پچاس سال پہلے اس بلوغ کو زندگی کے درخت پر اس قدر پکنے نہیں دیا جاتا تھا کہ وہ سڑ کر اپنے آپ بیچے گر پڑے اور پھر دنیا جہان کو متعفن کر دے۔ ماں، جس کی شادی دس سال کی عمر میں ہو گئی تھی، اس بات کو نہیں جانتی تھی۔ جس طرح بدن کے علم سے ناواقف لوگوں کے لیے پیٹھ کا ہر حصہ کمر ہوتا ہے، اسی طرح اس ناواقف، نا سمجھ اور نادان ماں کے لیے یہ خون کی خرابی، گرمی یا کوڑھ سے پرے کچھ نہیں تھی اور یہ سب کچھ کربخو، نیم اور اسپغول کے "سحر" کے آگے نہ ٹھہر سکتا تھا۔

اب ماں "کاؤ" نہیں کہنا چاہتی تھی۔ اگرچہ اسے کسی بات کی سمجھ نہیں آتی تھی۔ وہ جانتی تھی جب سے گھنڈی کا خون خراب ہوا ہے وہ بہت متلون ہو گیا ہے۔ گھر میں چیزیں بھوڑنے لگتا ہے اور جو بہت کچھ کہو تو اپنا سرفرش پر دے مارتا ہے۔ ماں خود ہی پینے بدلنے چلی گئی۔ گھنڈی کی چچی نے اپنے ہاں پکی ہوئی ترکاری تو دے دی لیکن ان کے ہاں کی پکی ہوئی چیز قبول نہ کی۔ ماں کا ماتھا ٹھنکا دس سال سے وہ رنڈا پنا اکیلی کاٹ رہی تھی اور اس نے کسی شریک کے

سامنے سر نہیں جھکا یا کھتا۔ آج جب کہ وہ کل کے تمام اسرار سے واقف ہو چکی تھی، بھلا کیوں جھک جاتی؟ ماں اپنی دیورانی کے ساتھ جی کھول کر لڑی۔ دیورانی نے بھی دھتا بتایا اور کہا: "دیکھا ہے ہم نے اتنی بڑی ناک لیے پھرتی ہے تو بیٹے کو سنبھالا ہوتا، جو بازار میں جھک مارتا پھرتا ہے۔"

ماں ٹھیک کہتی تھی کہ "چینی بدلنے" سے گھنڈی کا تعلق ہے تو جو برتنا نہیں چاہتی تو یوں کہہ دے۔ لیکن ذرا صل ماں کو کوئی بات سمجھ نہیں آتی تھی۔ خون خراب گھنڈی کا ہوا ہے اور وہ گالیاں رشید اور بنواری کو دیتا ہے۔ دیورانی برتنا مجھ سے نہیں چاہتی اور صلواتیں گھنڈی کو سناتی ہے۔ لیکن محلے کی دوسری عورتیں بھی ماں کو مطعون کرتی تھیں۔ ماں سخت پریشان ہو رہی تھی۔ آخر منشی جی سے لڑائی ہوئی۔ اس نے ڈانٹا کہ اگر گھنڈی نے ہمارے مکان کے ارد گرد کہیں پیشاب کیا تو اس سے برا گوئی نہ ہوگا۔

آخر مہمان کے سمجھانے سے ماں کو پتا چل گیا۔ اس نے نہ صرف اپنا سر پیٹا بلکہ ایک دو ہتھ پڑ بیٹے کے بھی جما دیا۔ ہائے تو نے باپ دادا کا نام ڈبو دیا ہے رے! پڑوسن کے ساتھ پھر لڑائی ہوئی اور ماں نے کھری کھری سنا دیں: حرام خور تجھے وہ دن یاد ہے جب تیری باہن حرام کروا کے نکلی تھی باوا کے گھر..... نہ اندھا دیکھا تھا نہ کانا۔ کرنے کی تھی..... اور وہاں جا کر گھڑا پھوڑ دیا تھا جانے کس کس کا گریب ایسر کے سر پہ! اور گھر آ کر ماں گھنڈی کو کوسے دیتی۔ گھنڈی جب سب حکیموں سے مایوس ہوتا تو ماں کی حکمت میں آرام پاتا تھا۔۔۔ لیکن ماں اسے گالیاں دیتی تھی۔ گور بھوگ لے تو کو! اب دنیا گھنڈی کی آنکھوں میں آبلہ تھی۔ ایک بڑا آبلہ جو اتر سے دکن اور پورب سے پچھم تک پھیلا ہوا تھا اور جس میں پیب کے دریا بہ رہے تھے۔

رات ہو گئی۔ ماں جھلنگے میں پڑی ابھی تک ٹھنک رہی تھی؛ یہ بیماری کہاں سے مول لے لی رے میرے دشمن! سارا جسم پھوڑے پھوڑے ہو چکا ہے یہ بیماری آگ ہے نری آگ۔ یہ امیروں کی دولت ہے۔ میں غریب عورت اس آگ کو کیسے بجھاؤں؟۔۔۔ میں ویدوں کو کیا بتاؤں؟ میں تمہاری ماں ہوں رے گھنڈی! شریک مجھے طعنہ دیتے ہیں۔ پڑوسی مجھے کھڑا کر لیتے ہیں اور عجیب بے ڈھنگے سوال کرتے ہیں رے“

گھنڈی قریب پڑا ہر قسم کی شرم و حیا سے بے نیاز ایک ٹک چھت کی طرف دیکھ رہا تھا۔ چھت میں لگے ہوئے نرکل اس کی آنکھوں میں اترائے تھے اور جھینگرا اس کے دماغ میں بولنے لگے تھے۔ اب تک ہوا کے جھونکوں میں تلخی کی نمایاں رفق پیدا ہو کر اس کے جسم کے ایندھن میں اور شعلے پیدا کر رہی تھی۔ کوارڈ بھی کھلے ہوئے تھے۔ گوندی سموم کے جھونکوں میں کراہ رہی تھی اور آسمان پر بد نما داغوں والا آتشک زدہ چاند اپنی پر قانی نظروں سے زمین کی طرف دیکھ رہا تھا۔۔۔ اس کے بعد گھنڈی کی آنکھوں میں پیٹ کی خمیر نے ایک غیر مرئی دھند سی پھیلا دی۔ اس کی پلکیں بوجھل ہونا شروع ہوئیں۔ نرکل چھت پر چلے گئے۔ جھینگروں نے زبان بند کر لی۔ پھوڑے رسنے بند ہو گئے۔۔۔

سب دنیا سو رہی تھی لیکن ماں جاگ رہی تھی۔ اس نے بیس کے قریب ہلا اس کی چٹکیاں نتھنوں میں رکھ لیں اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ دائیں ہاتھ سے اس نے دیا اٹھایا اور گھسٹی ہوئی اپنے بیٹے کے پاس پہنچی آہستہ آہستہ اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرنے لگی۔ گھنڈی سویا ہوا تھا لیکن ماں کی شفقت اس کے روئیں روئیں میں تسکین پیدا کر رہی تھی۔ ماں نے بیٹے کی طرف دیکھا، مسکرائی اور بولی! میں صدقے، میں واری... دنیا جلتی ہے تو جلا کر میرا لال جوان ہو گیا ہے تاہا اسی لیے... ہاتے مرے تیری ماں بھگوان کرے سے...“

## نامراد

صغیر، نقش بندوں کے ہاں کا بڑا لڑکا کالج سے گھر لوٹا تو کھانا کھا کر قیلو لہ کے لیے لیٹ گیا۔ سونے سے پہلے اس کے ہاتھ میں اخبار تھا جس میں لکھی ہوئی خبریں پیٹ میں بچیر کے ساتھ دھندلی ہوئی گئیں..... ہوتی گئیں..... صغیر کو پتا تھا کہ وہ سو رہا ہے، اس کے اعضا ایک تفریح اور تفریح کے قائل ہو رہے تھے۔ آپ سے آپ یہ خیال بھی اس کے دماغ میں آیا کہ مرتے وقت بھی کچھ اس قسم کا عالم ہوتا ہے جسم کے اعضا تھک کر چور ہو جاتے ہیں اور ایک ایسی تفریح اور تفریح کے قائل جس کا کوئی انجام نہیں۔ صغیر سو گیا لیکن وہ مرا نہیں۔۔۔۔۔

تفریح کا احساس کہاں..... ابھی اس کے اعضا نے تفریح بھی نہیں پائی تھی کہ اسے جھنجھوڑ کر جگا دیا گیا۔ اس نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں لیکن وہ کھل نہ سکیں۔ پلکوں کے لطیف پردوں میں خواب کی شاہراہیں — شریانیں، شرابی ہو رہی تھیں۔ اس نے اپنی آنکھیں دبائیں اور کھولیں وہ اس منظر کے لیے تیار نہ تھا وہ اس خبر کے لیے تیار نہ تھا جو آج کے اخبار میں نہیں چھپی تھی۔ بڑے نقشبند — امیر علی نقشبند، اس کے والد کھاٹ کے پاس کھڑے تھے اور قریب ہی ماں دروازے میں کھڑی کسی دکھ کے اظہار میں آنسو بہا رہی

متھی۔

• اٹھ بیٹا... ارے اٹھ بھی، اس قدر غافل مت ہو!

غافل کا لفظ نقش بندوں کے ہاں کثرت سے استعمال ہوتا تھا۔ اور اس کے معانی بھی مختلف تھے، ان معانی سے مختلف جن میں ہم تم اور زید بکر اسے استعمال کرتے ہیں۔ نقش بند تمام کے تمام بڑے متھی اور پرہیزگار لوگ تھے۔ ان کے خیال کے مطابق خدا کی یاد کے علاوہ جو وقت بھی گزرتا تھا عفت میں گزرتا تھا۔ کھانا پینا، نصاب رٹنا، سینما دیکھنا، سونا، سب عفت میں شمار ہوتا تھا۔ صدر نے اپنے آپ اندازہ کر لیا کہ نماز کے متعلق کچھ کہتے ہوں گے اور وہ جی چرا کے سونے لگا۔ جب بڑے نقش بند نماز، تسبیح اور روزہ استغفار کے متعلق کچھ کہتے تو صدر جگر کا ایک شعر پڑھ دیتا۔

محو تسبیح تو سب ہیں مگر ادراک کہاں

زندگی خود ہی عبادت ہے مگر ہوش نہیں

اس شعر میں انسان کے لیے کس قدر آزادی تھی وہ تو اب میں بھی آزاد تھا تو گناہ میں بھی آزاد، گناہ بھی عبادت تھی... پودوں کے ہوا سے سر ہلانے کا عالمگیر اثبات، پرندوں کے چہچہے، ستاروں کا ایک انجانے مرکز کے گرد طواف یہ سب کچھ عبادت تھی جو اٹھتے بیٹھتے سوتے جاگتے ہو رہی تھی۔ بڑی پھلی کا چھوٹی پھلی کو کھا لینا، انسان کا انسان کو کچل دینا، بطلان کا حق پر چھا جانا... یہ سب کچھ عبادت ہی تو تھی لیکن اگر وہ کاہل نہ ہوتا، اگر وہ سب سے نہ ہوتا تو اس کی عبادت مکمل ہو جاتی، کیوں کہ ماں اور بڑے نقش بند بھی اس شعر کو کاہلی کا ایک جواز سمجھتے تھے۔ ان کے خیال میں زندگی کے دریا میں بہتا ہوا تنکا ایک ارادہ رکھتا تھا۔ چاہے کس قدر بے فہماعت



تھا وہ۔ لیکن چند لہریں تھیں جو اس سے خوف کھاتی تھیں۔ اس تنگے سے اس پر کاہ سے.... لیکن ماں کی سسکیاں، یہ محض وہ غفلت نہ تھی، صندر گویا بجلی کے کسی تنگے تار سے چھو گیا اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔

بڑے نقش بند نے ستانت سے کہا "بیٹا! اٹھ کپڑے بدل لے تمہارے سسرال سے بلاوا آیا ہے۔"

"میرے سسرال سے؟ صندر نے حیرت سے پوچھا اور ماں کی طرف دیکھتے ہوئے بولا: ماں! —"

ماں نے اپنے جذبات کو دبائے ہوئے کہا "نامراد! اٹھ — جا تجھے تیری خوش دامن نے بلایا ہے۔"

"نامراد" اور خوش دامن کے الفاظ کچھ عجیب طریقے سے استعمال کیے گئے تھے۔ وہ نامراد کا لفظ اس وقت کہا کرتی تھی جب وہ گورہیں پٹے، خون تھوکے، کی معنوی حد سے ورے، بہت ورے محبت اور نفرت کی الجھنوں میں خفیف سی خفگی کا اظہار کرنا چاہتی تھی۔ لیکن آج اس نے نامراد کچھ اس طرح کہا تھا جیسے اس کا بیٹا صندر واقعی نامراد ہو... اور اس کی سنگیتر کی ماں کو وہ خوش دامن کے نام سے کم ہی پکارا کرتی تھی، وہ صرف رابعہ کی ماں کہہ دیتی تھی۔ صندر کا ماتھا ٹھنکا۔ آج خوش دامن کے لفظ پر زور دینے اور دہلیز پر کھڑے آنسو بہانے کی یہ وجہ تو نہیں کہ ماں کے ہاتھ سے خوشی کا دامن چھوٹ گیا ہے اور رابعہ کی ماں کے ہاتھ سے بھی؟

لیکن کیا مضائقہ ہے؟ صندر نے پل بھر میں سوچ لیا۔ اس نے اپنے ہاتھ سگریٹ کی طرف بڑھائے لیکن بڑے نقش بند کو دیکھ کر رک گیا۔ ان کے سامنے سگریٹ پینا، گھر بدر ہونا تھا۔ لیکن اپنی لا پرواہی کا اظہار کسی طرح ممکن

نہیں تھا۔ صفدر نے بھٹک کے چار پائی کے بیچے سے بوٹ کٹوا کر بنائے ہوئے  
سلیپر نکالے اور انہیں پہن کر گھرا ہو گیا اور اپنی ماں کی طرف غالی خولی نگاہوں  
سے دیکھنے لگا۔ کیا رابعہ کی ماں نے کوئی اور رشتہ دیکھ لیا؟ ... یا  
...؟ وہ اپنے آپ کو قریب دینا چاہتا تھا۔۔۔۔۔ بالفرض محال اگر رابعہ،

رابعہ بے چاری کو بچھ ہو گیا ہو تو پھر اسے بلا نے کی کیا ضرورت ہے؟  
بیچے زینے پر دھم دھم کی آوازیں آنے لگیں۔ سڑک پر کھلنے والی کمر کی  
سے گھر کے زینے کا آخری حصہ بھی نظر آتا تھا۔ گھر میں کون ہے، یہ دیکھنے کے لیے  
صفدر نے کمر کی کوکھولا اور بیچے جھانکا۔۔۔۔۔ جن تھا۔۔۔۔۔ رابعہ کا توکر شاید  
یہی وہ خبر لایا تھا جسے ایک ایک بتا دینے میں بڑے بڑے نقش بند اور اس کی  
ماں ایک قدرتی خوف کی وجہ سے تامل کر رہے تھے۔۔۔۔۔ اس وقت ابھی  
دوپہر ڈھل رہی تھی کہ آسمان پر سلاخوں کی قطاریں بڑے بڑے اور سست  
پروں کی طرح اڑنے لگیں۔ شہر کا دھواں گاڑھا ہو رہا تھا اور شہر کو پیش  
از وقت اندھیرے میں مبتلا کر رہا تھا۔

ماں ابھی تک کچھ بول نہ سکی تھی۔ یہ اس کی عادت تھی۔ وہ پیدائش،  
شادی اور موت، تینوں موقعوں پر اپنے جذبات کو لفظوں سے آسودہ نہیں  
کر سکتی تھی، بڑے نقش بند نے ارد گرد کوئی کرسی نہ دیکھی تو صراحی والی  
تپائی لے کر بیٹھ گئے جس پر سے عرصہ ہوا صراحی ہٹا دی گئی تھی۔ بوسے  
۔۔۔۔۔ "بیٹا! یہ بڑی بڑی خبر ہے، تمہاری رابعہ چل بسی۔" ماں  
نے اپنا منہ چھپا لیا اور پھر جلدی سے اپنے بیٹے کی طرف دیکھنے لگی۔۔۔۔۔  
صفدر اس خبر کے لیے تیار نہ تھا لیکن اس نے حیرانی سے منہ کھول دینے  
کے علاوہ اور کچھ نہ کیا۔



پوچھا تھا۔ درحقیقت وہ اس خبر سے بھونچکا سا رہ گیا تھا لیکن نقش بندوں کے ہاں کی جھوٹی حیا کی خاطر اس نے حیرت کا اظہار نہ کیا۔ اس نے بڑی مشکل سے کہا:

• ماں، کن تو مجھے اس کا بھائی ملا تھا... •

بڑے نقش بند نے اٹکتے ہوئے کہا—

• بیٹا صفدر! بے چاری اچانک چل بسی— اچانک... اسے

ایک خاص بیماری تھی •

اس خاص بیماری کے متعلق صفدر کچھ نہ پوچھ سکا۔ اس نے کپڑے اتارنے کے لیے کھونٹی کا رخ کیا اور اس کے ہاتھ خود بخود لباس میں کالے عنصر والی چیزوں کی طرف اٹھ گئے... خاص بیماری؟ اس نے اپنے آپ سے پوچھا۔ وہ جانتا تھا کہ عورتوں کو کئی قسم کی کہنے اور نہ کہنے کے لائق بیماریاں ہوتی ہیں۔ اس کے گھر میں خود اس کی ماں ہر وقت کسی نہ کسی تکلیف میں مبتلا رہتی ہے۔ گھر کے سب طاقتی شیشیوں سے بھرے رہتے تھے، جیسے اُسے کتابیں سجانے کا شوق تھا۔ اسی طرح اس کی ماں کو شیشیاں سجانے کا۔ لیکن دوسرے ڈاکٹر کے پاس جاتے وقت کوئی شیشی نہ ہوتی تھی اور بڑے نقش بند سٹیپٹایا کرتے تھے۔ وہ جتنا ماں سے اس بیماری کے متعلق پوچھتا اتنا ہی اُسے یہ کہہ کر ٹال دیا جاتا— پیٹ درد ہے— سرد گھر رہا ہے— چھاتی ٹھنک رہی ہے— ابجائیاں آ رہی ہیں— وغیرہ وغیرہ— اور اب اس نے عورتوں کی بیماریوں کے متعلق پوچھنا چھوڑ دیا تھا— وہ جانتا تھا کہ عورتوں میں برداشت کا مادہ زیادہ ہوتا ہے اور وہ عام طور سے بیماریوں سے بچ سکتی ہیں... لیکن رابعہ سرگئی!

صفدر نے پوچھا "سیت کب اٹھے گی میاں جی؟"  
 میاں جی نے جواب دیا "اٹھ نہیے۔ اس سے پہلے نہ اٹھ سکے گی۔"  
 ماں نے کہا "ایک بھائی جالندھر میں دکان کرتا ہے اسے بھی تار  
 دیا گیا ہے؟"

"آپ بھی شامل ہوں گے؟ صفدر نے پوچھا۔  
 "کسی پر احسان تھوڑے ہے..."  
 صفدر نے اصرار کرتے ہوئے کہا "میاں جی میں بھی آپ کے ساتھ  
 شامل ہو جاؤں گا؟"

صفدر نے دیکھا۔ اس قسم کے سوال بڑے نقش بند کو کچھ درست نہیں  
 معلوم ہو رہے ہیں، انہوں نے اپنے ہونٹ کاٹے اور کہا "تم میری بات  
 مانو گے یا اپنی کہے جاؤ گے؟"

صفدر نے سر جھکا لیا۔ ماں دخل دیتے ہوئے نرمی سے بولی:  
 بیٹا رابعہ کو تمہارے پہنچنے کے بعد نہلا یا جائے گا؟  
 اور ماں فرط غم سے رونے لگی۔ اس نے دیوار کے ساتھ اپنا سرمانے  
 ہوئے کہا:

"ہائے میری بیٹی۔ میں تجھے بہو بنا کر لاتی اس گھر میں...  
 صفدر کو اور بھی حیرت ہوئی لیکن وہ بغیر مزید سوال کیے چل دیا۔  
 سیڑھیاں اترتے ہی اُسے جمن مل گیا۔ جمن بڑی شدت سے صفدر کا انتظار  
 کر رہا تھا۔ اس کی آنکھوں سے بھی پتا چل رہا تھا کہ وہ روتا رہا ہے۔  
 صفدر نے کہا "جمن! لیکن جمن نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ صفدر کو دیکھ کر  
 پھر سے رونے لگا۔ صفدر نے کہا "چلو... اور جمن روتا ہوا ساتھ ہولیا

## کو کھ جلی

صنفر چلتا گیا اور سو چتا گیا۔ اس کے جانے کے بعد، ہی رابعہ کو نہلا یا جائے گا۔۔۔ کیوں؟۔۔۔ کیوں؟۔۔۔ رابعہ کے ہاں لوگ سخت پردے کے قائل تھے۔ آج اس کا اس گھر میں داخل کیسے ہو گا؟۔۔۔ اس گھر میں جس میں اسے داماد بن کر، سہرے باندھ کر داخل ہونا تھا۔۔۔ وہ اندر کیسے جائے گا؟ اس نے اپنی "تمھاری" کو دیکھا بھی نہیں تھا۔ وہ "نامراد" تھا۔ ماں اور خالہ کے کہنے کے مطابق رابعہ تو بصورت تھی، ہزاروں میں سے ایک لیکن اگر وہ شادی کے بعد بصورت نکلتی تو وہ کیا کر لیتا؟ اس سے کسی نے پوچھا نہیں تھا ممکن ہے لوگ لمبوترہ چہرہ نا پسند کرتے ہوں۔ لیکن اسے ایسا چہرہ پسند ہے، اور اس نے بچپن سے ہی ایک خاص قسم کے گوشوارے اپنی دلہن کو پہنانے کا ارادہ کر رکھا ہے جو لمبوترہ چہرے پر اچھے دکھائی دیں۔۔۔

جمن بڑی خاموشی سے سیلا کچھلا تو لہ کدھے پر ڈالے، تنگے پاؤ

صنفر کے پیچھے پیچھے چلا آ رہا تھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے وہ صنفر باہر کے نقوش پا پر اپنے پاؤں رکھ کر چل رہا ہے لیکن صنفر نے اس مجروح جذبات والے فرماں بردار نوکر کو باتوں سے آزمانا نہ چاہا اور وہ چلتا گیا اسے دو سے تین فرلانگ شہر کی تنگ و تاریک گلیوں اور بازاروں میں سے، جہاں بہت ہی شور و شغف تھا، گزرنا تھا۔۔۔ ممکن ہے رابعہ کو اپنا سنگیتر یاد نہ ہوتا۔۔۔ اور صنفر نے اپنے گورے چٹے ہاتھوں کو دیکھا اور بازار میں چلتے ہوئے ایک بہانے سے سوڈا واٹر والی دکان میں لگے ہوئے شیشے کے سامنے گھڑا ہو گیا۔ اس کے بال سلجھے ہوئے نہیں تھے لیکن اس کے چہرے سے ایک حسین بے نیازی دکھائی دے رہی تھی جسے صنفر نے خود بھی محسوس کیا۔۔۔ لیکن یہ تو "عطارد بگوبیدہ" والی بات تھی۔۔۔ اس وقت

دوپہر شام میں ڈھل چکی تھی۔ کبوتروں نے اڑاڑ کر تاروں پر بیٹھنا شروع کر دیا تھا۔ ایک کبوتر نے ستم غل یعنی سے صفدر کے کوٹ پر بیٹھ کر دی۔ جتن نے دوڑ کر اسے تو لیا سے پو پو بچھ دیا۔

”رہنے دو۔۔۔ صفدر نے کہا۔ میں ایسی ہی ذلت کے لیے پیدا

ہوا ہوں۔۔۔“

وہی صفدر نے یہ فقرہ یوں ہی کہہ دیا۔ لیکن اس سے جتن کو بہت تسلی ہوئی اور وہ اب تک یہی سوچتا رہا تھا کہ صفدر بابو کو رابعہ بی بی کے مرنے کا ذرا بھی افسوس نہیں لیکن صفدر اپنی گتھیاں سلجھا رہا تھا۔۔۔ اسے افسوس تھا لیکن اس کی آنکھوں میں آنسو نہ آسکے اور دکھاوے کے لیے وہ رونا نہیں چاہتا تھا۔ اسے خیال آیا کہ عجب کیا جو اسے ناپسند کرتے ہوئے رابعہ نے کچھ کھا لیا ہو۔ اور خوف سے اس کا جسم اور روح کانپنے لگے۔۔۔ شاید رابعہ کی ماں نے اپنی اسی حماقت کی طرف توجہ دلانے کے لیے اسے بلایا ہو لیکن ایسی باتیں کہنے کے لیے تو اسے دنیا کے ماں باپ کی طرف رجوع کرنا چاہیے تھا۔

ایک جگہ صفدر نے پیچھے مڑ کر جتن کو پکارا۔

جتن نے کہا ”ہاں سرکار“

”بی بی کو کیا تکلیف تھی؟“

جتن کا گلا پھر رقت سے بھر آیا۔ اس نے کہا:

”بڑا غم ہوا سرکار۔۔۔ بڑا گھور غم ہوا۔۔۔“

”رابعہ بی بی نے کھا لیا کچھ؟“

”ہے ہے۔۔۔“



جمن نے دونوں ہاتھ ہلاتے اور کانوں کو چھوتے ہوئے کہا۔  
 ”رابعہ بی بی ایسی نہ مٹی سفیر با یو... اس ایسی ٹیک لڑکی میں نے  
 آج تک نہیں دیکھی۔ تمہاری نوکرائی نے بتایا ہے؟  
 ”ہماری نوکرائی؟“

سفیر نے حیرت سے پوچھا اور پھر کہا:

”اچھا— تمہاری بیوی نے!“

جمن نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔

”کنواری بی بی کے متعلق یہ بات کہنے لائق نہیں ہے۔ جو میں گناہ کرتا ہوں

تو... اور یہ کہتے ہوئے جمن نے زمین پر سے مٹی چھوٹی اور کانوں کو ہاتھ  
 لگایا۔ ”تو اللہ بخش دے... بی بی نہانے والی تھی کہ اس نے ٹھنڈے پانی  
 سے نہالیا اور اس کے بعد وہ بالکل جڑ گئی...“

”نہانے والی تھی تو نہالیا“ سفیر نے حیرت سے پوچھا اور پھر سمجھتے

ہوئے بولا: ”اوہ— ہاں— میں سمجھ گیا جمن۔ اس میں گناہ کی کون سی  
 بات ہے؟“

اور پھر دونوں خاموشی سے چلنے لگے۔ سفیر کا بلانا اس کے لیے اور بھی

سخت بن گیا۔ اسے ایک گونہ تسلی ہوئی، کہ رابعہ اپنے منگیتر کی وجہ سے مایوس نہیں

ہوئی۔ وہ اس قدر اچھی لڑکی تھی۔ اسی لیے وہ ”نامراد“ تھا۔ سفیر کو پھر

محسوس ہوا کہ وہ رابعہ کے لیے ہمدردی کا جذبہ پیدا کر رہا ہے... کوشش

سے... محنت سے... دراصل اُسے اپنے آپ کو کچھ محسوس نہیں ہوتا

شاید ماتم کدے میں پہنچ کر اس کا دل ہیج جائے لیکن اگر اس سے رویا نہ

گیا تو بڑی بات ہوگی اور اگر وہ رو دیا تو اور بھی بڑی بات ہوگی۔

صنڈر کے خیالات پیچھے کی طرف دوڑ گئے۔ جب رابعہ کی ماں لڑکا دیکھنے آئی تھی۔۔۔۔۔ جب اس نے صنڈر کو دیکھا کھٹا۔۔۔۔۔ مجھے دیکھا تھا اور رابعہ کو کسی نے نہ پوچھا تھا۔ وہ خود رابعہ تھی ورنہ وہ کس طرح اسے پسند کر سکتی تھی؟ اس وقت وہ رابعہ کی ماں کا داماد نہیں تھا۔ وہ ایک لڑکا تھا، خوش شکل متناسب جسم والا۔۔۔۔۔ ایک مرد۔۔۔۔۔ اور رابعہ کی ماں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ رابعہ کے لیے یہ مناسب ہے۔ اس نے اپنے ذہن میں رابعہ اور صنڈر کو اکٹھے کھڑے دیکھ لیا تھا۔۔۔۔۔ کیا اچھی بوڑھی تھی۔ لیکن اس وقت رابعہ کہاں تھی؟ تخیل میں صنڈر کے ساتھ کھڑی رابعہ کی ماں تھی، رابعہ نہیں تھی۔۔۔۔۔ اور صنڈر کو ان فرسودہ رسموں سے نفرت تھی۔ کیوں نہیں اسے رابعہ کو دکھایا گیا؟ اور کیوں نہ رابعہ اُسے دکھائی گئی اب رابعہ مر چکی ہے اور وہ اس کے لیے کچھ بھی محسوس نہیں کر رہا۔ وہ کیوں ان کے دکھ درد میں شریک نہیں ہو سکتا؟۔۔۔۔۔ اب اُسے کیوں بلایا جا رہا ہے۔ اُسے چڑانے کے لیے؟ ان پابندیوں پر آنسو بہانے کے لیے؟۔۔۔۔۔ سر پینے کے لیے؟

آفتاب منزل کے سامنے پہنچ کر صنڈر کھڑا ہو گیا۔ گھر میں خاموشی تھی ایک پُرا سرار قسم کی خاموشی، جو عام طور پر ماتم والے گھر میں نہیں ہوتی۔ شاید ماتم کرنے والے صبح سے رو رو کر نڈھال ہو چکے تھے۔ ان کے گلے سوکھ گئے تھے اور اب ان کے جسم کا رواں رواں رو رہا تھا۔ یہ خاموشی رونا تھا، جوانوں سے کہیں زیادہ تھا۔ دکھاوا تو تھا نہیں۔ جوان بیٹی دیکھتے دیکھتے ہاتھوں سے چلی گئی تھی۔ صنڈر رک گیا۔ وہ خود حیران تھا کہ وہ اس گھر میں کس طرح داخل ہو رہا ہے۔ رابعہ کو بھی اس قسم کی تعلیم نہ دی

گئی تھی، جس سے وہ یہ حرکت نہ کرتی۔ وہ شرم و حیا کی پتلی، عفت اور پاکیزگی کا مجسمہ ایک جھوٹی شرم کا شکار ہو کر رہ گئی۔ کیا اس نے مرنے سے پہلے ایک بار بھی صفر کے متعلق سوچا ہے؟ نہیں قطعاً نہیں۔ اسے کیا معلوم صفر کس قسم کا آدمی ہے۔ اس کا کوئی خیالی دو لہا ہو گا جیسے ہر لڑکی کا ہوتا ہے لیکن وہ صفر نہیں ہو گا۔ وہ کوئی اور ہو گا۔ ایسے ہی جیسے اس کی خیالی دلہن یقیناً رابعہ سے مختلف ہو گی اور وہ رابعہ کے لیے اسی طرح محسوس کرے گا جیسے اس نے کسی بھی مرنے والی لڑکی کے لیے محسوس کیا ہو۔ وہ اس گھر میں کیا استحقاق رکھتا ہے؟ وہ کیوں داخل ہو۔ اسے کیا حق ہے؟ وہ آگے بڑھا۔ ٹھٹکا۔ بڑھا۔ اسے جمن کو بھیج کر بلا یا گیا ہے۔۔۔

رابعہ کی چھوٹی بہن قر، جو سنگنی میں بھی صفر کے ہاں آئی تھی، دوڑی ہوئی باہر آگئی۔ اس کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ "دو لہا بھائی آگئے"

صفر نے اپنی طرف دیکھا وہ دو لہا بھائی تھا، کالے کپڑے پہن کر اپنی دلہن کو لینے آیا تھا۔۔۔ اسے سب کچھ عجیب معلوم ہوا، ایک ڈھونگ ایک نیم سیاہی چال۔۔۔ اسے یہاں کیوں بلا یا گیا تھا؟۔۔۔ رابعہ کا بھائی آیا۔ اس کی آنکھیں سوچی ہوئی تھیں۔ اس کی قمیص کے بٹن کھل رہے تھے۔ شلوار کا ایک پانچہ اوپر شیفے میں تھا اور دوسرا زمین پر گھسٹ رہا تھا۔ وہ مادے کے احساس سے اوپر روح کی تکلیف میں مبتلا تھا۔ روح جس نے جسم کا حلیہ بگاڑ دیا تھا، وہ چیخا اور اس نے صفر کو بازو سے پکڑ لیا۔ گویا وہی ان کا مجرم تھا وہ بھی اسے دو لہا بھائی کہنا چاہتا تھا لیکن اس نے نہ کہا۔ وہ فقط روتا رہا۔ بالغ آدمی کا رونا جو ہر عمر کے انسان کے رونے سے زیادہ کرہیہ ہوتا ہے۔ کیوں کہ وہ رونا نہیں چاہتا لیکن روتا ہے۔ پھر اس کے

جہرے کے تناؤ کسے جاتے ہیں اور وہ انہیں چھپاتا ہے۔

صنذر گھر میں داخل ہوا۔ گھر میں برتن اور کپڑے ادھر ادھر بکھرے ہوئے تھے۔ رابعہ کی ماں بال بکیرے بیٹی تھی وہ جھول رہی تھی۔ فریڈ غم سے وہ ایک جگہ بیٹھ نہ سکتی تھی۔ وہ جیتی تھوڑے ہی تھی وہ سر چکی تھی رابعہ جیتی تھی۔ رابعہ کی ماں سر چکی تھی۔ صنذر کو دیکھتے ہوئے اس نے نہایت خوفناک آواز سے چلانا شروع کیا۔ ایک بند دروازوں والے کمرے کے اندر سے بھی کسی بزرگ آدمی کے رونے کی آواز آئی۔ غالباً یہ رابعہ کے باپ تھے، جو کسی کے سامنے رونا نہیں چاہتے تھے۔ اب صنذر کو رونے کے لیے کوشش کی ضرورت نہ تھی۔ آنسو اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ گزر رہے تھے۔

رابعہ کی ماں گرتی پڑتی اٹھی اور وحشیانہ انداز سے صنذر کے گلے میں بازو ڈالتے ہوئے بولی: بیٹا! تو اس گھر میں سہرے باندھ کر آنا بیٹا میں تیرے شگن مناتی، میں تیرا سر جو متی لیکن میں رونے کے سوا کچھ نہیں کر سکتی۔ اللہ کو میرا رونا منظور تھا...! صنذر کے سامنے ایک لاش ڈھکی پڑی تھی۔ ماں باپ، ساس سسر کے ارمائوں کی لاش۔۔۔۔۔ رابعہ...۔۔۔۔۔ صنذر...۔۔۔۔۔ صنذر کو رونے کے لیے کوئی بھی کوشش نہ کرنا پڑی۔ اس کے دل میں ایک اُبال سا آیا۔۔۔۔۔ وقتی اُبال، جو شاید رابعہ کو سامنے پڑے دیکھ کر نہیں آیا تھا بلکہ اپنے ارد گرد انسانیت کے دکھ درد کو دیکھ کر آیا تھا۔ رابعہ کی ماں نے کہا: بیٹا! تو کیوں روتا ہے؟... لیکن رابعہ کی ماں نے اس کے رونے میں ایک خوشی، ایک تسکین سی محسوس کی۔ اگر وہ نہ روتا تو...۔۔۔۔۔ صنذر کو رابعہ کی ماں نے آخر کس لیے بلایا تھا؟ رابعہ کی ماں نے کہا: بیٹا! تو کیوں روتا ہے؟ تیرے لیے دلہنیں بہتری۔ میرے لیے بیٹی نہیں کوئی میری

رابعہ مجھے کہیں نہیں ملے گی۔ صدف نے جی، جی، جی میں غصہ کا اظہار کرتے ہوئے کہا، تمہارے ادہام! تمہاری جھوٹی حیا کا شکار لڑکی شاید اب تمہیں نہ ملے گی۔ شاید تم اس سے اس کھوٹے سکے کے طلب گار نہ ہو گے۔۔۔ تم لوگ ظالم ہو۔۔۔ بے رحم۔۔۔ میں ظالم ہوں، بے رحم اور سنگ دل۔۔۔ شاید میں دل کی تہہ سے آنسو لاتا، لیکن اب رابعہ کون ہے؟۔۔۔ یہ میری دلہن نہیں۔۔۔“

رابعہ کی ماں نے صدف کو روٹے دیکھا تو خاموش ہو گئی۔ نہ جانے کیوں خاموش ہو گئی اور پھر بولی: ”بیٹا، تو مت رو۔ میں تیرے لیے دلہن لاؤں گی۔ رابعہ سے بھی زیادہ خوبصورت۔ اس سے بھی زیادہ لمبے بالوں والی۔۔۔ تیری روتی ہے پزار۔۔۔ لیکن میری بیٹی نامراد جا رہی ہے اس دنیا سے۔ اسے ایک بار دیکھ لے۔ اس کی شادی یہی ہے کہ تو اسے ایک نظر دیکھ لے۔ دیکھ۔ دیکھ۔ دیکھ میں تجھے کیا دے رہی تھی، نصیبوں جلے!“

صدف اس بات کے لیے تیار نہ تھا، اسے اپنے ماحول سے نفرت ہو رہی تھی۔ ایک عجیب طرح کی ہمدردی آمیز نفرت، ان بکھرے ہوئے برتنوں ان پھٹے ہوئے کپڑوں، اس کفن۔۔۔ اس لاش۔۔۔ سے ایک قسم کی ہمدردی اور نفرت۔۔۔ وہ یہاں سے بھاگ جانا چاہتا تھا۔ اسے پورا بھروسہ تھا کہ اسے ناحق پریشان کیا جا رہا ہے۔ اسے یقین تھا کہ مرنے والی کی روح کو ناحق اذیت دی جا رہی ہے۔ محض خود غرضی، محض اپنی آسودگی کے لیے وہ اس ماتم والے گھر میں اس ”دوسری لڑکی“ کے متعلق کچھ بھی سننے کے لیے اور پھر مرنے والی کی ماں کے منہ سے۔۔۔ اسے حیرت

ہوئی... لیکن وہ چپ رہا... وہ بھاگ نہ سکا۔ ایک خاص قسم کا تجربہ اس پر چھا گیا جو مُردے کو دیکھنے کے لیے ہر زندہ شخص پر چھا جاتا ہے۔ وہ جانتا تھا کہ وہ ڈر جائے گا لیکن وہ رابعہ کو دیکھنا چاہتا تھا۔ اسے سہاگن بنانا چاہتا تھا۔ وہ نامراد تھی اور صفدہ خود نامراد تھا۔ رابعہ کی ماں نے رابعہ کے منہ پر سے کپڑا ہٹا دیا۔ رابعہ خون کے کھولنے کی وجہ سے سیاہی مائل بتائی جاتی تھی لیکن اب اس کا خون کھول نہیں رہا تھا۔ اس کا خون سرد ہو گیا تھا، جم چکا تھا... سُرخ اور زردی نے مل کر ایک عجیب قسم کی سفیدی پیدا کر دی تھی۔ ہوا میں اس کے بالوں کی ہلتی ہوئی لٹ سے اس کے زندہ ہونے کا گمان ہوتا تھا۔ وہ کس قدر خوبصورت تھی۔ موت میں اور بھی حسین ہو گئی تھی۔ اس کا لمبو ترہ چہرہ جس پر صفدہ کے تھیل میں بسے ہوئے گوشوارے کتنے مناسب دکھائی دیں... لیکن وہ سب غیر مانوس تھا۔ وہ اس گھر کا دولہا تھا، لیکن ایک اجنبی تھا... اور پھر ایک دولہا! رابعہ کی ماں اسے کوئی کم درجہ دینے کو تیار نہ تھی۔ اس نے ایک بار پھر پلاٹے ہوئے کہا

”صفدہ بیٹا! دیکھ میں تجھے کیا دے رہی تھی۔ میری بیٹی نامراد جباری ہے۔ نہیں، میری بیٹی نامراد نہیں ہے۔ صفدہ!...“

صفدہ نے پھر ایک دفعہ بھاگنے کی کوشش کی۔ لیکن اس کے پاؤ زمین میں گرے ہوئے تھے۔ اس کا دماغ پکرا گیا تھا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ رابعہ نامراد ہے یا وہ خود۔ صفدہ۔۔۔ جو دونوں ایک دوسرے سے نامحرم ہیں۔ یا رابعہ کی ماں نامراد ہے جو دونوں کو جانتی ہے!

## جپ میں چھوٹا تھا

ان دنوں ہم جہانگیر آباد میں رہا کرتے تھے۔ ہم لوگوں کا وہاں ایک پڑانا لیکن بہت بڑا مکان تھا جسے ہم پرتھوی بل کہا کرتے تھے۔ پرتھوی بل زمین کی طاقت ہر جگہ بالعموم یکساں ہوتی ہے، لیکن شہر کی مٹی میں ہمیں وہ طاقت نہیں ملتی جو پرتھوی بل میں پھیر آتی تھی۔ وہاں کی کشش ثقل ایک چیز کی علاحدہ تھی۔

قدرت کی ہر اچھی چیز پرتھوی بل کے عین قریب مل جاتی تھی۔ ابھی کروندے کا خیال آیا۔ باہر آکر دیکھا تو بوا دتا اچار ج جو پھل بیچنے کے علاوہ ہر جانے والوں کی آخری رسوم ادا کرتا ہے، کروندے اور سنگھاڑے بیچ رہا ہے۔ اگر اڑو با، کر گھ کے متعلق سوچا تو وہ باہر موجود ہیں۔ ہو سکتا ہے ہماری سوچ چند ایک کھٹے میٹھے پھلوں اور چند ایک لغو قسم کے کھلونوں تک محدود ہو، تاہم سب کچھ ہم تک اپنے آپ کھینچا چلا آتا تھا۔

ہمارے گھر کے ساتھ ہی ایک چھوٹی سی ندی بہتی تھی جس کے دونوں کناروں پر ایک ذخیرہ تھا۔ ہماری کہانیوں کے جن دیو اور پریاں سب اس چھوٹے سے ذخیرے میں رہا کرتی تھیں۔ ہماری نگاہ ہمیشہ اس ذخیرے میں اُلجھ



جانی تھی اور جس طرح گھر کر آئے ہوئے باہروں میں بچے کو اپنی مرضی کی شبیہ مل جاتی ہے اسی طرح اس ذخیرے کی ہر شاخ ہر پتہ ہمارے دل کی کہانی بن جاتا تھا۔ جب ہم بچے پر تھوی بل کے کھلے انگن میں کبڑی بارہ نکال اور شاہ شاپو کھیلنے ہوئے ٹھوک جاتے اور دماغ ایک نیا کھیل ایجاد کر لینے سے عاجز آجاتا، تو ہم ندی میں نہانے کے لیے چلے جاتے۔ حالانکہ وہاں جانا منع تھا۔ لیکن تمام ممنوعہ چیزوں کو آزمانا مثلاً سلائی کی مشین کی ہتھی کو گھمانا، عشق پچاں کو فنی سے کاٹ ڈالنا، ہمارا محبوب ترین شغل تھا۔۔۔۔۔

بچوں کی نفسیات صحت

کسی نے کہا ہے چھ سال کی عمر میں بچوں کے جسم خوراک سے اور دل تجربہ سے بڑے ہوتے ہیں لیکن ان کا تخیل، ان کا شعور، سکا شفی سے بڑھتا ہے۔ ڈانٹ ڈپٹ نصیحت ان کے لیے بالکل بے معنی ہوتی ہے۔ ان کے شعور کے کسی کونے میں بھک سے اڑ جانے والا ایک جذباتی مادہ ہوتا ہے جسے معمولی طور پر چھو دینے سے ان کا شعور ایک نیا رنگ ایک نئی حد یا دونوں وضع کر لیا کرتا ہے۔ ان کی آنکھوں میں آنسوؤں کے سیلاب اُٹھ آتے ہیں۔۔۔۔۔ ان کے سپنوں کے رنگ چند منٹے واسے نقوش اختیار کر لیتے ہیں۔۔۔۔۔

باہلوگوں کے اس بڑے کنبے میں سب سے چھوٹا میں تھا۔ جب میں چھ برس کا تھا تو میرے والد کی عمر پچاس سال کے لگ بھگ ہو گی میرے والد کو نزلے کی دیرینہ شکایت تھی۔ وہ کچھ گنگنا کر بولتے تھے۔ ان کا دماغ آسانی سے خوشبو یا بدبو میں تمیز نہیں کر سکتا تھا۔ کبھی کبھی ان کی باتوں پر لوگ منہ پھیر کر ہنس دیتے تھے۔ میں ہنستا بھی تھا اور افسوس بھی کرتا تھا۔

بو باس کے دماغ میں نہ سمانے پر اکثر انھیں خود بھی اپنے آپ پر رحم آیا کرتا تھا۔ نزلے کی وجہ سے ان کے سر اور ڈاڑھی کے بال برف کی طرح سفید ہو چکے تھے۔ اگرچہ وہ جسمانی لحاظ سے کافی تندرست تھے۔ بیساکھی کے ارد گرد ہمارے گاؤں میں کسی نہ کسی کے ہاں ضرور بچہ پیدا ہو جایا کرتا تھا اور وہ اپنے بچے کا نام رکھوانے کے لیے میرے والد کے پاس آیا کرتے تھے۔ اور والد صاحب بچے کا نام عمر دین، خیر دین، نانک چند اور فاطمہ وغیرہ رکھ دیا کرتے تھے اور سب لوگوں کو وہ نام قبول ہوتا تھا۔ یہ نام اکثر بیساکھی کے روز رکھا جاتا تھا اور شیرینی بانٹی جاتی تھی۔ بیساکھی کی ہوا جو گندم کو اس کے خوشے سے الگ کرتی ہے ان کی نرم، ملائم اور سفید ڈاڑھی کو دو حصوں میں بانٹ کر دونوں شانوں پر پھینک دیتی تھی۔ اور یہ نظارہ ہمارے دل میں ایک قسم کی ٹھنڈک اور پاکیزگی پیدا کرتا تھا۔

میرے والد کنبہ کے سب بچوں کو اکٹھا کر لیا کرتے تھے، اور ان کے شور و غل سے بچنے کے لیے انھیں کہانیاں سنایا کرتے تھے۔ ان کی کہانی عام طور پر ان کی زندگی کے کسی خاص واقعے سے تعلق رکھتی تھی اور اس میں اصلاح کا پہلو نمایاں ہوتا تھا۔ کہانی عموماً یوں شروع ہوتی تھی۔

جب میں چھوٹا تھا تو...

میرے خیال میں بہت سے ماں باپ اور بہت سے بزرگ اپنے بچوں کو کہانی سناتے ہوئے اس فقرے سے شروع ہوتے ہیں۔ جب میں چھوٹا تھا یا چھوٹی تھی.... اور انجام کار یہی ثابت ہوتا ہے کہ ہمارے بزرگ بچپن ہی سے مضبوط ارادے کے مالک تھے اور سچائی کے پتلے تھے۔ انھوں نے کبھی شرم و حیا کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ کبھی جھوٹ نہیں بولے اور

بڑوں کے سامنے کبھی گستاخی سے پیش نہیں آئے۔ ان کے اخلاق کی بڑائی ان کی بچپن کی ہر حرکت سے ظاہر تھی۔ ایسی باتیں سن کر میرا جی بھی یہی چاہتا کہ ان کی مانند نیک بن جاؤں۔ یہی میرا مطمح نظر تھا۔ مجھے اپنے والد ایک بہت بڑی شخصیت دکھائی دیتے تھے یا دوسرے لفظوں میں وہ ایک عظیم طاقت تھے، جس سے ضلع کا بڑے سے بڑا حاکم بھی انکار نہیں کر سکتا تھا۔ جہانگیر آباد کے سب آدمی ان کے سامنے تعظیماً سر جھکا دیتے تھے اور بڑے بابا کے سوا انہیں اور کسی لقب سے یاد نہیں کرتے تھے۔ مجھے بتایا گیا تھا کہ وہ میرے ہی باپ ہیں۔ لیکن وہ ایک تقدس مآب بزرگ ہونے کی حیثیت سے قصبہ کے سب لوگوں کے باپ۔ ایک پتاما دکھائی دیتے تھے، جیسے خدا کل عالم کا باپ اور ایک پتاما ہے۔

جہاں تک مجھے یاد ہے میرے والد نے خود ہی ایک عام پدرانہ سی پُرسفقت روش اختیار کر رکھی تھی۔ کسی چھوٹے کے نزدیک آنے سے ان کا دایاں ہاتھ اپنے آپ اُشیر واد کے لیے اٹھ جاتا تھا۔ یہ کس قدر ظلم تھا کہ اس عام پدرانہ روش میں پہلے جان بوجھ کر اور پھر عادتاً انہوں نے اپنے بہت قدرتی رجحانات اور جانب دارانہ جذبات اور خیالات کو کچل دیا تھا۔

ان کے بچپن کی ایک کہانی ہم سب بچوں کو بہت بھائی تھی۔ ہم بہت سے بچے ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر پرکھوی بیل کے کھلے صحن میں بیٹھ جاتے اور اپنے بزرگ کی ایک ہی کہانی، ان کی زندگی کا سب سے اہم واقعہ بار بار دہراتے۔ یہ بات بہت ضروری تھی کہ بالکل کہانی کہے لو اسی انداز میں

آنکھیں منکا کر اور چمکی بجا کر، اور شائقی وہ کہا لئی ڈہرائے تو ویسے ہی آنکھیں  
 منکا کر اور چمکی بجا کر۔ میرے والد کی کہانی، ہم سب بچوں کو اسکول کے پہاڑوں  
 کی طرح ازبہ یاد اور باسی روئی کی طرح مرغوب تھی۔ اگر میں اس کہانی کا ایک  
 لفظ بھی بدل دیتا تو باقی بچوں کے نزدیک کوئی بہت بڑا جرم کرتا۔ اس وقت  
 میرے چچیرے بھائی اور چھو پھیر ہی نہیں فوراً احتجاج کے لیے اٹھ کھڑی ہوتیں  
 وہ کہانی چوہوں کے متعلق تھی اور ایک طرح سے ہمارے خاندان میں گیت  
 بن چکی تھی۔

کہانی یوں تھی:

جب میرے بابا اور چچا دیوا چھوٹے ہوتے تھے، تو ان کے دل میں  
 چوہے پکڑنے کا خیال پیدا ہوا۔ اس بڑے سے دیو صورت پرکتھو کی بل کی  
 جگہ ان دونوں ایک چھوٹا سا ٹوٹا پھوٹا مکان ہوتا تھا جس میں چوہوں کے  
 بڑے بڑے بل تھے۔ چوہے ہر روز پیر کی ٹکیہ یا بابا کی مرغوب باسی روٹیاں  
 لے جایا کرتے۔ چچا دیوانے ایک ہنجرہ لگایا۔ سب چوہے پھنس گئے۔ ایک  
 چوہا بھاگ کر سرنگ میں گھس گیا۔ اب آپ کو یہ جانتا چاہیے (بچے  
 اس بات کے نہ ڈہرائے جانے کو کبھی برداشت نہیں کرتے تھے) سرنگ ایک  
 بڑا لمبا چوڑا بل ہوتا ہے جس میں سے چوہے گزر کر ذخیرے اور ذخیرے سے  
 واپس اپنے مکان میں آجاتے ہیں۔۔۔۔۔ بابا نے ایک ہنجرے کو سرنگ کے منہ  
 پر رکھ کر اسے شہتوت اور کرندے، توڑیے کے گودے اور بے کے گھونسلے  
 سے ڈھک دیا۔ اگلی صبح چچا دیوا کی بہت نہ پڑی کہ وہ ہنجرے تک چلے  
 جائیں اس لیے بابا اکیلے ہی گئے۔ اکیلے!  
 (ڈہرائے ہوئے) بابا ایک چھوٹے سے بچے تھے۔

انہوں نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے ہنجرے پر سے پتے ہٹائے تو کہا دیکھتے ہیں وہ — وہاں ایک چوہا تھا۔ شہزی رنگ کا، پورے قدر کا ٹٹکتا ہوا اور ٹٹکتا ہوا، ٹٹکتا ہوا اور ٹٹکتا ہوا؛

”بابا اتنے گہرائے، اتنے گہرائے کہ جو یوں سمیت دوڑتے ہوئے چوکے میں چلے گئے۔ (ہمارے لیے کہانی کا یہ حصہ سب سے زیادہ سنسنی پیدا کرنے والا تھا) جو یوں سمیت دوڑتے ہوئے چوکے میں چلے گئے۔“

وہ بھاگ کر آئے اور چچا دیوا کو آواز دی — دیوا ہو دیوا، دیوا ہو۔ اور آواز دیتے ہوئے وہ دونوں ہاتھ اپنے منہ کے دونوں طرف رکھ لیتے تاکہ آوازِ آدمِ بگرنے نہ پائے اور آوازِ سیدی چچا دیوا تک پہنچے۔ پھر وہ اتنی زور سے پلائے کہ آواز ایک چیخ میں بدل گئی۔ پھر چیخ کھانسی کی صورت اختیار کر گئی۔ کھوں کھوں کھوں کھوں نہہہ! پھر بابا اور چچا دیوا ابل کر سرنگ تک چلے گئے — جو تے پہنے ہوئے! ان کے ہاتھ میں شہتوت کے دو بڑے بٹے مگروسے تھے بابا نے جو بے کو مار دیا۔ بالکل مار دیا، اور جہانگیر آباد کے چنڈالوں سے جو بے کی کھال کھینچو اکرا سے چھت پر رکھ دیا۔ جب کھال سوکھ گئی تو پھر انہوں نے اسے بھیجو چنڈال کے ہاتھ بیچ دیا۔ بھیکو نے اسے کسی اور کے ہاتھ بیچا۔ اس نے کسی اور کے ہاتھ... اور ایک آدمی نے اس کی فریاد دی۔ آج کل بڑی بھابی کے سوٹر کو وہی فریاد ہوئی ہے۔

اب معاملہ برداشت کی حد سے بڑھ جاتا۔ سب بچے جھوٹ جھوٹ بکواس بالکل بکواس کا شور مچا دیتے۔ یہ ممکن نہیں کہ مولیٰ جرنیل بھابی کے خوبصورت سوٹر کو ایک ذلیل جو بے کی فریاد ہے۔

آپ نے دیکھا۔ اس واقعہ میں کوئی اصلاح کا پہلو نہیں ہے۔ اپنے والد کی

زندگی کا یہی ایک واقعہ تھا جس سے ان کی کمزوری کی جھلک دکھائی دیتی تھی۔ وہ خود کتنے ڈرپوک تھے۔ حالانکہ ہمیں ہمیشہ بہادر بننے کی تلقین کرتے تھے بچوں کی ذہنی نشوونما کے لیے اس قسم کے واقعات نام نہاد ادب، تمیز اور دوسری نصیحت سے ہٹی ہوئی کہانیوں سے زیادہ موثر ہوتے تھے۔ ان سے ہمیں حقیقت کا پتا چلتا تھا اور ہماری کجی میں آتا تھا کہ ہمارے بزرگ بھی کبھی بچے تھے۔ ورنہ دوسری طرز کی کہانیوں میں وہ بچے کی جگہ ہمیں بوڑھے ہی نظر آتے تھے۔ گویا وہ ناف تک پہنچتی ہوئی داڑھی بچپن ہی سے ان کی تھوڑی پر موجود تھی۔

شرارتِ لالی علمی ایک قسم کی زندگی ہے جس سے بچے پھلتے پھولتے ہیں۔ قدرت ان چیزوں کو بچوں کی جبلت میں دے کر انھیں بڑھاتی ہے۔ ہم نے اپنے ارتقا میں دیکھا ہے کہ عقل اور علم و ادب کے پیدا ہونے کے بعد جسمانی اور روحانی ترقی رک جاتی ہے۔ بچوں کو عقل اور علم کی ضرورت ہے۔ مگر اسے آہستہ آہستہ گویا ہکا شفی کے طور پر آنا چاہیے نہ کہ اسے جھوٹ پرچ، طور بے طور ان پر کھونسا جائے۔ ان کی زندگی میں سلائی کی ہمتی کو گھمانا، بلا اجازت ندی میں نہانا، عشق پیچاں کو جڑ سے کاٹ دینا اور اس قسم کے سیکردوں عادات پیش آتے ہیں، جن سے ان کو تنبیہ کی جاتی ہے۔ ان کی جبلت کو دبایا جاتا ہے۔ لیکن کیا وہ دب جاتی ہے؟ اور اگر دب جاتی ہے تو کیا اسے دبا کر خاطر خواہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے؟

سردیوں کی ایک صبح کو بالکنڈ نے ایک گھوڑے کو دنان پر سے کھول دیا۔ بابا اسے پکڑنے کے لیے کھیتوں کے اونچ نیچ میں دوڑے ان کی ڈاڑھی اڑ رہی تھی۔ ان کی سرخ ٹوک دارناک سے پانی بہ رہا تھا کیا اچھا نظارہ تھا۔ اور اس سے ایک دن پہلے ہم سب آئے کی پٹریاں بنانے



کے جرم میں پٹ چکے تھے۔

آخر ہمارے اخلاق کو بہتر بنانے اور ہماری عاداتوں کو سنوارنے کے لیے ہمارے بزرگوں نے ہمیں ایک استاد رکھ دیا جو سوائے ہمارے باقی سب کی عزت کرتا تھا۔ ہمارے استاد نے اپنے مقصد کے حصول کی خاطر ایک انوکھا طریقہ ایجاد کر لیا۔ ہم میں سب سے زیادہ متابعت کرنے والے لڑکے کو "بادب" یا تمیز کا سرخ نشان دے دیا جاتا تھا۔ اس جدت سے ہم بہت متاثر ہوئے لیکن درحقیقت اس امتیازی نشان نے ہماری ذہنیت کو اس طرح غلام بنا دیا جیسے سرکار ہمارے کسی قومی بھائی کو دیوان بہادر یا خان بہادر بنا کر اس کے ہاتھ پاؤں کو حرکت اور آزادی کی زندگی کے عمل سے روک دیتی ہے۔ اس قسم کے اعزاز پانے والے لڑکے کو ہم بڑے رشک و حسد کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور اکثر "بادب یا تمیز" کے الفاظ میں سے "ادب" اور "تمیز" کے دونوں الفاظ حذف کر کے ایک بکری کے بچے کی طرح ..... یا..... سمیٹنے لگتے۔ اگرچہ میں اس بات کو مانتا ہوں کہ ہماری اس قسم کی حرکت میں انگور کھٹے ہیں کا جذبہ کار فرما ہوتا تھا اور حقیقت اور آزادی کا تجسس کم تھا۔

بہار کے موسمی اعتدال نے آہستہ آہستہ اپنی میانہ روی چھوڑ دی اور اس کی خوش خلقی میں تلخ مزاجی بڑھنے لگی۔ یہ وہ دن تھے جب شہتوت کی کونپلیں پورے طور پر پھوٹ نکلتی ہیں اور اس میں پھل پیدا ہو کر راہ رو کو لچھاتے ہیں اور چنار کے چوڑے چوڑے پتے اپنی گھنی چھانوں سے، ماں کی گود کا سا سکون دیتے ہیں۔ لمبی لمبی ٹوریوں، اس کے ارد گرد کے پھول پتوں میں زندگی کی پگنٹس اور کلوروفل کی صورت میں دوڑ جاتی ہے۔





سٹی کے ساتھ کھیلنے سے منع کیا جاتا تھا لیکن وہ سٹی کے ساتھ اپنے رشتے کو گنتی نہیں۔ اس رشتے کو جو ماں باپ بھائی بہن کے رشتے سے زیادہ گہرا تھا... کہیں زیادہ گہرا اور ابدی...

اسی دن میں نے ہا ہا کو سب کا بلا اجازت نزدیکی میں نبھانے اور دھول سے کھیلنے کا واقعہ کہہ سنایا۔ ٹرکیاں اور لڑکے پھریٹ گئے۔ انسان کی فطرت کتنی آزادی کی طالب ہے۔ ملکی آزادی، جسمانی اور شخصی آزادی، روحانی آزادی... اس کا اندازہ کوئی بااخلاق قلام نہیں لگا سکتا۔ انسان تو چاہتا ہے کہ اسے روٹی کپڑے کی صنعت سے بھی آزاد کر دیا جائے۔ پرنسٹون کی ٹیل نے مجھے ذہین اور بااخلاق بنا دیا۔ میرے بزرگ بہت ہی خوش تھے کہ میں دوسرے بچوں کی طرح گستاخ نہیں تھا لیکن... مجھے معدے کی شکایت رہتی تھی۔ ہونچے جانوروں کی طرح چرتے رہتے، خندہ رست رہتے لیکن میں جو کھالے میں بہت احتیاط سے کام لیتا ہمیشہ بیمار رہتا۔ ڈاکٹر کہتا تھا زندگی کو اینیسا ہے۔

دیوان خانے میں مندر کی صندوقچی کے پاس ایک قلم دان رکھا تھا اس پر چند پیسے پڑے تھے۔ میں ایک لمبے جلا کر اس کی مدھم مدھم روشنی میں کتاب پڑھ رہا تھا لیکن میرا دل، میری سامنے شہوت اور چنار کے پتوں سے گزرتی ہوئی ہوا کی سیٹیوں کی طرف متوجہ تھی۔ میرا منہ بڑے بڑے اور لمبے شہوتوں کا جائزہ لے رہا تھا۔ اور میرے ہاتھ پاؤ ایک خواب آلود پانی کے اندر چپوؤں کی طرح حرکت کر رہے تھے۔ میں نے کھر کی میں کھرے ہو کر ایک تڑی اور بے کے گھونسلے کو پرے ہٹا دیا... مجھے محسوس ہوا انسان کا ارض و سما کی وسعتوں سے بھی ایک رشتہ ہے۔

## کو کھ جلی

پر تھوی بل کے باہر بوا دتا اچارج بدستور کروندے اور سنگاڑے پنج رہا تھا۔ میں نے میز کے قریب کھڑے ہو کر نفرت سے اپنے جسم پر لگے ہونے سمرخ نشان کو دیکھا۔ پھر کانپتے ہوئے ہاتھوں سے میں نے قلم دان کی طرف ہاتھ بڑھایا اور وہاں سے پیسے اٹھالیے اور نشان کو پھاڑ کر کھڑکی کے باہر پھینک دیا۔

جب میں قرنطین سے باہر تھا۔ وہ سبز خاموش سپاہی مجھے دیکھ کر مسکراتے تھے۔ میری جرات کی داد دیتے تھے۔ میرا دل بے پایاں آسمان کی طرح کھل رہا تھا۔

شام کو مجھے بخار ہو گیا۔ میرا دل اور میرا جسم قدرت کی سخاوت کے قابل نہ رہا تھا۔ پھر میرا ضمیر مجھے برابر سرزنش کرتا رہا۔ میری نبض تیز ہو گئی۔ شام کو بابا آئے۔ ان کا چہرہ مجھے ٹیڑھا میڑھا معلوم ہو رہا تھا۔ پھر رنگارنگ نقطے بسط ہونا شروع ہوئے لیکن ان نقطوں اور حلقوں کے درمیان مجھے بابا کی دودھیا سفید ڈاڑھی بدستور ٹھنڈک پہنچاتی رہی۔ میں نے بابا کو بتایا کہ اماں نے مجھے چوری کے الزام میں بہت پیٹا ہے۔ حالانکہ میں نے چوری نہیں کی۔ معاً مجھے یاد آیا۔ بابا نے بھی اپنی زندگی میں ایک چوری کی تھی۔ لیکن جب انہوں نے چوری کا اقبال دادی اماں کے سامنے کر لیا تھا اور اس دن اماں جان جو پیسوں کے متعلق پوچھتی رہیں تو میں نے صاف لا علی کا اظہار کر دیا۔ اس وقت مجھے بار بار یہی خیال آتا تھا کاش میں اپنے بابا کی طرح کشادہ دل انسان ہوتا اور اپنے جرم کا اعتراف کر لیتا۔

اچانک ایک بہت بڑے درد نے میرے جسم اور ذہن کا احاطہ کر لیا۔ کچھ دیر بعد مجھے یوں معلوم ہوا جیسے کوئی پرہشفتت ہاتھ میرے سر کی تمام گرمی کو کھینچ رہا ہے۔ میں نے ہولے ہولے آنکھیں کھولیں اور بابا کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا:



## آخری اسٹیشن

جیون — یا بہتر طور پر جیون دو آبہ اس لائن کا آخری اسٹیشن تھا اور گاڑی اس کی طرف بے تکانہ بھاگی جا رہی تھی جس طرح نکلنے سے پہلے شعلے میں ایک لپک پیدا ہوتی ہے اسی طرح گاڑی کی رفتار میں بھی ایک لپک پیدا ہو رہی تھی۔ دائیں اور بائیں شواکھ سے سلسلے دو لمبے لمبے بازوؤں کی صورت کھل رہے تھے، اور اس وسیع وسیع آغوش کے اندر چھوٹے چھوٹے ٹیلے، گینگ ہٹ، آم، جھاڑیاں، جھونپڑیاں، گاڑی کے آخری چکر کو پکڑنے کے لیے بچھے کی طرف بھاگ رہی تھیں۔ دور کہیں پٹھو اور مویشی گروپے میں پڑے ہوئے کنکروں کی مانند ایک بہت بڑے دائرے میں گھومتے دکھائی دیتے تھے۔

اس وقت بارش تھی ہوئی تھی لیکن کچھال اور آم کے پیڑوں کی سیاہ چھال سے اندازہ ہوتا تھا کہ دن اور رات کے چار پہروں میں چھاٹوں ہی پانی پڑ گیا ہے۔ سورج برساتی شام کے شوخ و شنگ رنگوں کے درمیان یاد دل کے ایک ٹکڑے میں الجھا ہوا پریشان نگاہوں سے زمین کی طرف دیکھ رہا تھا۔ کتنی کہرتی، اور سیل جسے اس نے اٹھانا تھا، پانی زمین پر کہیں کم تھا

اور کہیں زیادہ۔ ہوا ساکن تھی اور گاڑی کی کھڑکی سے باہر دیکھنے پر یوں معلوم ہوتا تھا جیسے آسمان زمین کے ساتھ ٹکرا کر پاش پاش ہو گیا ہے۔

کبھی آن واحد میں یوں محسوس ہونے لگتا جیسے باہر دکھائی دینے والا ہر ایک نظارہ ہمارے ہی کسی اندرونی منظر کا عکس کھینچ رہا ہے۔

جے رام اُداس تھا اور اسے فضا میں مغمومیت دکھائی دیتی تھی۔ وہ گاڑی میں کھڑکی کے پاس بیٹھا بے کلمی سے جیموں دو آہ ٹرمینس کا انتظار کر رہا تھا کبھی وہ درد سے اپنی سیٹ پر اچھل جاتا اور کبھی سامنے چوٹیوں پر دھندلی سی دکھائی دینے والی برف کو دیکھ کر اس کی انگلیاں اس کے سفید بالوں میں دھنس جاتیں اور وہ سوچتا۔۔۔ جس طرح گاڑی ایک لیک کے ساتھ اپنے مقام آخر کی طرف بھاگی جا رہی ہے، شاید میں بھی اپنے مقام آخر کی طرف لپکا جا رہا ہوں۔ یکا یک اس نے مقابل کی نشست پر پڑی ہوئی مانی کو جھنجھوڑتے ہوئے کہا:

”بھولی مانی! اٹھ دیکھ! تیرا جیمون آرہا ہے!“

مانی ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ اس کے چہرے کا جلال جو ایک چالیس سالہ رنڈاپے اور لاؤدی کا شاخسانہ تھا اور جو کسی ناخوش گوار خواب کی وجہ سے مدھم ہو گیا تھا، عود کر آیا اور وہ ایک بچی کی طرح خوش ہو کر بولی ”اگیا جیمون۔۔۔ بس یہاں سے سات کوس پرے رہیں میری بیٹی اور جنوائی۔۔۔ میری سیتا رام کی جوڑی!“

باہر سے ایک ننھی سی کنکری اُڑی اور جے رام کی آنکھیں پڑ گئی کچھ دیر کے لیے اس کی آنکھیں اندر کی طرف سرٹ گئیں۔ پتلیاں قدرے پھیلیں اور حقیقت حال کی غلش سے باوجود اسے گزرے وقت کے ڈراؤنے خواب دکھائی

دینے لگے زرد رو۔ جفاکش، شکست آشنا بے رام نے اپنے ماضی میں جھانکا تو اسے اپنے بے کیف پچاس برسوں میں ایک حیات افروز لمحہ نظر آیا۔ اس وقت جب کہ بے رام زندگی کی بیسویں خزاں دیکھ رہا تھا، کرتاپور اسٹیشن کے پیادہ پر ایک لڑکی اس کی طرف دیکھ کر مسکرائی اور کئی دن بے رام کی عقل و حیا محبت کے گوپھیے میں پڑی رہی۔

ایک دھکسا لگا اور قریب کے شور و غل سے پتا چلا کہ گاڑی جیون دو آبہ ٹرمینس کے احاطے میں داخل ہو کر کھڑی ہو گئی ہے۔ بھولی مانی اور اس کے ساتھ دوسرے مسافر اترے اور باہر نکلنے کے لیے پھاٹک کی طرف بڑھے۔ اس وقت شام لمحوں کی سولی پر تڑپ رہی تھی اور سیاہی کی لہلی لہلی لٹیں اوپنے اوپنے کھبوں، پل اور شیڈ کی مدد سے دن کے شانوں پر بکھر رہی تھیں۔ بے رام بھی غم اور کپڑوں کی گٹھڑیاں اٹھائے پھاٹک کی طرف بڑھا لیکن رک گیا۔ اس وقت کٹھنر گاڑی جانے کا اسے سمبندھ دکھائی نہیں دیتا تھا۔

معاذ بے رام کو ایک ایسا خیال آیا جو اس نے سفر سے پہلے سوچا ہی نہ تھا۔ اسے اب کٹھنر گاڑی میں پہچانے گا کون؟ وہ کھٹون کے ایک پیرانے خاندان سے تعلق رکھتا تھا لیکن کھٹ کچھ تو جیون اور کچھ ہوشیار پور اور اس کے نواح میں آباد ہو گئے تھے اور اپنے پیڑوں کی وجہ سے جیون میں ایک خاص شہرت کے مالک تھے۔ کٹھنر میں صرف ایک تایا بابو کی خبر ملتی تھی لیکن وہ تو بے رام کے بچپن ہی میں ضعیفی اور جھکی ہوئی کمر سے یوں دکھائی دیتے تھے جیسے قبر تلاش کر رہے ہوں۔ اس وقت ان کا موجود ہونا ایک ناممکن سی بات تھی۔ ان کی چار پانچ لڑکیاں تھیں جو ایک ساتھ شادی



کے بعد سنتو کھ گڑھ، اور نہ، گڑھ شکر اور اس کے نواح میں اس طرح بکھر گئی تھیں جیسے آتشیں انار کی چنگاریاں چھوٹے ہی چاروں طرف بکھر جاتی ہیں اور جے رام پلیٹ فارم پر پڑے ہوئے پنخ کی طرف لوٹا اور مایوسی کے عالم میں ادھر ادھر دیکھنے لگا۔

بچوں دو آبہ ایک فاصلا بڑا اسٹیشن تھا۔ کبھی بچوں ایک بڑی سنڈمی ہوا کرتی تھی جس کے لیے اسٹیشن پر ایک یا رڈ تعمیر کیا گیا تھا جو ان دنوں سونا پڑا تھا۔ لائن پر پکھانے کے لیے پتھر تو ابھی تک بھیجے جا رہے تھے سائینڈنگ میں بڑا سا کریں یکہ و تنہا بیکار و بے مصرف کھڑا دور سے یوں معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی مرغ ہے جسے بھوننے کے لیے اس کے بال و پر نوچ لیے گئے ہوں اس کریں سے پیچھے ہٹ کر دو مال گاڑیاں کھڑی تھیں جن کے چھتوں کے نہ ہونے سے ان میں پتھر اور بارش کا پانی پڑا تھا۔ سائینڈنگ کے شمال کی طرف ریل پر چند کھوکھو کریں تھیں۔ ایک کھوکھو باقیوں کی بہ نسبت کافی فاصلہ پر تھی اور یہ دور صرف اس لیے بنائی گئی تھی کہ ابجن کو شنٹ کرنے میں آسانی رہے۔ یا اگر گاڑی تیزی و تندہی میں آگے نکل جائے تو اسے پٹری پر سے اترنے یا ٹکرانے کا خطرہ نہ رہے۔ اور لوہے کی یہ بڑی بڑی اور مضبوط کھوکھو کریں جے رام کو ہر اسان کرنے لگیں۔ جے رام نے سوچا کاش یہ ریلیں ایک دم ان کھوکھو کریں پر رُک جانے کی بجائے سامنے دکھائی دینے والی پہاڑی میں گم ہو جائیں۔

جے رام نے اٹھ کر اپنے جسم کو ایک بوسیدہ اور پیوند لگے کبیل میں اچھی طرح سے لپیٹا اور ایک نہایت مشتبہ انداز میں اسٹیشن کے جنگلے کے ساتھ ساتھ گھومنے لگا۔ جنگلے کے قریب اندھے کنوئیں پر پیل کا ایک تننا

بڑھا ہوا تھا اور ایک لنگور اپنی لمبی سی دم کو تنے پر بل دے کر کنوئیں میں اوندھا لٹکا ہوا تھا۔ اس کے کالے کلوٹے چہرے میں دو بھوری سی آنکھیں راکھ میں دبکتے ہوئے کونلوں کی طرح نظر آرہی تھیں۔ گھاٹیوں کے پیچھے پانی بڑے زور شور سے بہ رہا تھا اور اس برسائی نالے کے شور میں جیچوں کے قصبے کا سب شور ڈوب رہا تھا۔ اسٹیشن کی فضا خاموش اور افسردہ تھی۔ جدھر سے جے رام آیا تھا اُدھر لائٹوں کا ایک جال بچھا ہوا تھا۔ ایک بڑے جنکشن اسٹیشن پر ہی کم از کم اتنی لائٹیں تھیں جتنی جے رام کے جسم میں شریانیں اور وریدیں اور وہاں سینکڑوں ہی غلامی، قلی اور یارڈ میں تھے، جو آتی جاتی گاڑیوں کے درمیان بے کھٹکے بے مطلب بے مطلب گھومنا کرتے۔ کبھی کبھار کوئی ایجنٹ آگنا فانا دندناتا ہوا شید کے دوزخ سے سرمہ اڑاتا ہوا کسی کو جھپٹ میں لے لیتا، لیکن صبح سے پہلے کوئی اور مائی کا لال اس کی جگہ پُر کرنے کے لیے آدھکتا۔ اور جے رام نے سوچا یہاں جیچوں کی کسی سوئی لائن پر کوئی بے کھٹکے سر رکھے اور سو رہے۔

جب سے جے رام آیا تھا کسی نے ٹکٹ بھی تو نہیں پوچھا۔ ایک صاحب جو انداز سے اسٹیشن ماسٹر اور کپڑوں سے حجام معلوم ہوتے تھے، کرتا اور تہمد پہنے ہاتھ میں ناریل سنبھالے، کھڑاؤں سے کھٹ کھٹ کرتے ایک ٹوٹے ہوئے لیپ کے ستون کے قریب کھڑے ہو کر کانٹے والوں کو بے تخاصہ صلواتیں سنارہے تھے۔ کانٹے بدستور گالیوں سے بے اعتنا دور کھڑے سبز اور سُرخ بتیوں کی پریڈ کر رہے تھے۔ اسٹیشن کے اسٹاف نے یہاں وردی پہننے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی تھی۔ کہیں برس میں ایک آدھ بار ٹریفک انسپکٹر آ نکلتا تو اس کا حصہ چپکے سے ہاتھ میں کھتا دیا جانا اور پھرتے دھونے

کرتے ہیں ہی سرج دکھائی دینے لگتی۔ بہت ہوتا تو وہ بڑے شفقانہ انداز میں اسٹیشن ماسٹر سے کہہ دیتا۔۔۔

”مر جاؤ گے مادھو لال۔۔۔ مر جاؤ گے سردی میں تم لوگ؟“ انسپکٹر پیسوں کی حدت اور اسٹیشن ماسٹر جیون کی سردی سے کسی قدر آشنا ہو گیا تھا ”مر جاؤ گے تم لوگ“ کا جواب ایک مختصر دہونہہ، کے سوا کچھ نہ ہوتا۔ جے رام گھوم پھر کر پھر اندھے کنوئیں کے پاس جا کھڑا ہوا اور اس کی تہہ میں لٹے ہوئے ڈھکنے، قمچیاں، پیپل کے پتے، پتھر اور پانی کو دیکھنے لگا۔ لنگور اس وقت تک کہیں بھاگ گیا تھا۔ اس کی جگہ چند چھوٹے چھوٹے بندر قلابازیاں لگانے لگے۔ ایک ننھا سا بندر اپنی ماں کے پیٹ کے ساتھ چمٹا ہوا نیچے گویا موت کو دیکھ کر منہ چڑا رہا تھا۔ جے رام نے کنوئیں میں چھلانگ لگا کر زندگی کی اس لغو نقل کو ختم کرنے کی ٹھانی۔ لیکن وہ اس کار خیر کے لیے بہت بوڑھا ہو چکا تھا۔ جیسے اوپر بندر کا بچہ موت کا منہ چڑا رہا تھا، اسی طرح موت جے رام کا منہ چڑا رہی تھی۔

دور گھاٹیوں پر چند روشنیاں ایک سمت کو جاتی ہوئی دکھائی دیں جے رام اس تیس برس کے عرصہ میں بہت کچھ بھول چکا تھا۔ لیکن اسے یہ نظارہ کچھ مانوس سا معلوم ہوا۔ جنگل سے پرے بیٹھے ہوئے وہ اسٹیشن ماسٹر کے قریب پہنچے ہوئے بولا:

”یہ روشنیاں کیسی ہیں بابو؟“

اسٹیشن ماسٹر نے سوچوں کا ایک بڑا سا فلٹر اٹھایا اور ایک بھٹی

سی آواز میں بولا: ”یہ لوگ گاڑ جا رہے ہیں؟“

”کون گاڑیں؟“

”یہی ٹھٹھر — سنو کھ گڑھ بگیڑہ“

جے رام خاموش ہو گیا۔ اس خیال سے اُسے ایک گونہ تسلی ہوئی کہ جیون دو آبے سے پرے بھی ہزاروں پگڈنڈیاں شوالک کے گرد مل کھاتی چلی جاتی ہیں جس طرح تنا سح کے پہلے طالب علم کو موت کے دروازے میں سے جھانکنے پر اپنی ہی سیکڑوں شبیہیں دکھائی دی تھیں، اور حیات و موت اسے صرف ایک کھیل سا نظر آیا تھا۔ اس طرح ان پگڈنڈیوں کو دیکھ کر جسم و روح میں لرزہ پیدا کر دینے والی ریلوں کی ٹھوکریں جے رام کے لیے بے معنی ہو کر رہ گئی تھیں۔ جیون دو آبہ ایک براچ لائن کا ٹرینس ہو تو ہو، لیکن انسانی قدموں سے بنی ہوئی پگڈنڈیوں کا اختتام نہیں۔

اسٹیشن ماسٹر نے پھر موچھیں اٹھائیں اور بولا:

”تم کون ہو؟“

جے رام نے ایک سرد آکا بھری اور بولا:

”میں کون ہوں؟ — میں ایک مسافر ہوں بابا۔“

مسافر کا لفظ ہم شکست پسندوں کی لغت میں ایک خاص معنی رکھتا ہے ایک خاص انداز میں، مسافر، کہنے سے دو سنے والے ایک ہی دنیا میں منتقل ہو جاتے ہیں۔ ایسی دنیا میں جہاں ٹکٹ پوچھنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوتی، اور اس بے حد جذباتی اور روایات کا منظر لیے ہوئے لفظ سے گفتگو اور ہی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ اسٹیشن ماسٹر جس کے پردادا کو لقوہ کی شکایت تھی، کچھ تتلایا۔ پھر اس نے اپنا ہاتھ ران پر مارا۔ اور پھر ایک لمبی سرد آکا بھرنے کے بعد انجن کی طرح بھاپ چھوڑتے ہوئے بولا۔

”ہو بابا — ہر شے مسافر ہر چیز راہی!“

اور پھر ٹرینس اسٹیشن والوں کے لیے مسافر کا لفظ ایک خاص وسعت اور حدود رکھتا ہے۔ اسٹیشن ماسٹر نے اپنی بات کو جاری رکھتے ہوئے ایک فرسودہ سامصرعہ دہرایا۔

”اپنی اپنی بولیاں سب بول کر اڑ جائیں گے۔“

اور یہ مصرعہ اسٹیشن ماسٹر نے کسی شاعر کے دیوان کی بجائے لاری کے ایک تختے پر خدا کے بندو، سکھ اور مسلم ناموں کے درمیان مقید اور محفوظ پڑھا تھا اور شرابی ڈرائیور کی ہر ممکن غلطی اور ٹھڑے کا جواز تھا۔ یہ ایک اسٹیشن ماسٹر کو پتا چلا کہ اس مصرعے کے پڑھنے سے وہ یکلخت اپنی جیورس ڈکشن سے پرے ذلیل لاریوں اور پرندوں کی دنیا میں چلا گیا ہے۔ اس نے بات کا رخ بدلتے ہوئے سوراہے کی ایک چوپائی پڑھی اور بولا:

”ہو بابا! — یہ دنیا مسافر خانہ ہے — ہر ایک کو آنا جانا ہے۔“

یہ سننا سننا مٹھیا مایا ہے — کوئی اپنا ہے نہ پرایا ہے —“

اس بات کے بعد جے رام نے اپنے آپ کو اسٹیشن ماسٹر کے بہت قریب محسوس کیا اور وہ اس کے پاس لاٹھی ٹیک کر بیٹھ گیا۔ اس زمین میں کچھ دیر طبع آزمائی کرنے کے بعد رسمیات میں داخلہ ہوا۔ اسٹیشن ماسٹر نے پوچھا:

”آپ کا دولت خانہ کہاں ہے؟“

جیرام نے مسکراتے ہوئے اپنی کرم خوردہ بیٹی دکھائی اور اپنے مذہبی اور

ملی انگسار سے بولے: ”میرا عزیز خانہ کھٹھر ہے — اور آپ کا؟“

میں، ہمیر پور یا ٹھا کر ہوں —“

’بندہ، کی جگہ، میں، کا لفظ آجانے سے جے رام کو اچنبھا ہوا۔ لیکن اسٹیشن

ماسٹر سچا تھا۔ ٹھا کر بندے نہیں ہوتے۔ یہ تو بہت کیا کہ وہ، میں، ہو گئے، اور نہ

ہم سے ورے کوئی صیغہ استعمال نہیں کرتے۔ جے رام کچھ جھینپ گیا یکا یک اسے خیال آیا کہ ٹھا کر ٹھٹھرا گا توڑ کے داماد بھی ہیں اور اگر مصلحت اپنے بے سنگم پن کی بنا پر گدھے کے سے ناقابل قبول جا توڑ کو اپنا باپ بنا لیتی ہے، تو ایک نوع سے اسٹیشن ماسٹر کو اپنا داماد متصور کر لینے سے کون سا گناہ ہوتا ہے۔ جے رام نے باپچھیں کھلاتے ہوئے خوشامدانہ لہجہ میں کہا۔

”ہو ٹھا کرے! — ٹھا کروں کے ہاں ہمارے ٹھٹھرا کی بھی ایک لڑکی ہے۔  
 ”ہاں ہاں! اسٹیشن ماسٹر نے موچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے کہا ”میرے بڑے بھائی کی بیوی ٹھٹھرا تی ہے۔“

جے رام لاکھی چھوڑ کر کھڑا ہو گیا۔ پھر اس نے کسبل میں اپنے بازو پھیلا دیے اور پوں دکھائی دینے لگا، جیسے کوئی گدھ پرواز کرنے لگا ہو۔ آنکھوں کو سکیر کر اس نے ایک مرتبہ پھر اسٹیشن ماسٹر کی طرف غور سے دیکھا اور بولا:

”تم کیدارے کے چھوٹے بھائی ہو؟ بچو باورے... ہے ہے ہے بچو باورے...“ اور جے رام پھر ہنسنے لگا۔

اسٹیشن ماسٹر نے ادھر ادھر دیکھا جیسے کوئی آنا فانا ننگا ہو جانے پر ادھر ادھر دیکھا کرتا ہے۔ ایک مسافر قریب ہی کھڑا اس عجیب و غریب نام کو سن کر مسکرا رہا تھا۔ اسٹیشن ماسٹر نے راز داری میں جے رام کو آنکھ ماری اور سر کو ایک جھٹکا دیا۔ گویا کہہ رہا ہو ”ہوں تو بچو باورالین یار چپ رہو۔ یہاں ذرا عزت بنی ہوئی ہے اور مادھولال کے نام کے سوا مجھے اور کوئی کسی نام سے نہیں جانتا۔“ جے رام نے دونوں ہاتھوں میں اسٹیشن ماسٹر کا ہاتھ بھینچ لیا اور بازو گویا کلوں کے لیے اس کے گلے میں ڈال دیے اور نسبتاً اونچی آواز میں بولا: ”چھوڑو یارو۔ لوگوں کے لیے تم ہو گے مادھو وادھو۔ پر جے رام کھٹ کے لیے تم بچو

## کو کھجلی

باوے ہو۔ اُف! اُف! اکتھی دیر کے بعد تمہیں پایا ہے اور یہ نام ہم نے بھارت ورش کے پرسیدھ گویتے کے نام پر تمہیں دیا تھا۔ یاد ہے تم نے ٹیکر چنت پورٹی پر ایک بہت ہی بھدی آواز میں مالکونس کی دھن الاپی کھی، تب سے...

ہو ہو...

اسٹیشن ماسٹر کو سب کچھ یاد تھا لیکن وہ اسے بھولنا ہی قرین مصلحت سمجھتا تھا۔ اس وقت بندر نے ایک زقذ لگائی اور مادھولال کے کندھے پر آ بیٹھا۔ مادھولال نے متوجہ ہوئے بغیر ایک خفیف سی بھوں پڑھائی اور اسے ایک طرف ہٹا دیا۔

جے رام بولا "بجو باورے! تمہارے ہاں کتنے بندر ہیں؟"

"کبھی بہت کھے۔ اب تو روز بروز کم ہوتے جا رہے ہیں۔" مادھولال نے جواب دیا اور ایک معلوماتی بات سنانے کا فخر حاصل کرتے ہوئے بولا "یہ بندر بہت مفید جا تو رہے۔ سنتے ہیں کوئی ڈاکٹر وارٹوف ہے جس کے بھریوں کے لیے یہاں کے بندر پکڑ کر لے جائے جا رہے ہیں؟"

"ڈاکٹر وارٹوف؟"

"ہاں۔"

"کوئی روسی ڈاکٹر ہے؟"

"ہاں۔"

"کیا کرتا ہے وہ بندروں کا؟"

شتر لینہ صفت مادھولال نے اسی دم بجو باورے کا بدلہ چکاتے ہوئے کہا "جب کوئی شخص تم سا بوڑھا ہو جاتا ہے اور کسی قابل نہیں رہتا، تو اس میں بندروں کے غدود شامل کر دیتے ہیں۔ پھر وہ نئے سرے سے جوان بن جاتا ہے۔"



شاید جے رام کے ذہن میں شہر کا کوئی اشتہاری مضمون چکر لگانے لگا۔  
 ”یہ سائنس بھی کیا واہی تباہی ہے“ جے رام نے کہا اور مسکرا دیا۔ مرد اپنی قوت  
 کے متعلق کوئی ایسی ویسی بات برداشت نہیں کرتا اس لیے جے رام نے اپنی  
 بات کو جاری رکھتے ہوئے کہا: ”ان سفید بالوں سے بڑھانہ سمجھ لینا بچو باورے“  
 اور دونوں دیر تک ہنستے رہے جے رام بولا ”ان غرودوں سے بندر کی  
 سی پھرتی بھی پیدا ہو جاتی ہوگی؟“

”یہ تو نہیں کہہ سکتے“ مادھو لال بولا ”لیکن بھائی یہ تجربہ خوب ہے۔ ڈاکٹر  
 وارنوف کا۔ اور اسے اپنے تجربہ کے لیے بندر بھی ہر دو ارجنٹ پورٹی و غیرہ سے ہی  
 ملتے ہیں۔ یہ لوگ آئینہ میں اپنا منہ دیکھتے ورنہ انھیں ہندستان کا رخ نہ کرنا پڑتا  
 اب چند برسوں سے یہ بندر پکڑے جا رہے ہیں۔ وقت آئے گا یہاں ایک بھی  
 نہ ہوگا اور سچ پوچھیے تو مہابیر کی مورتیاں اب بھی کم دکھائی دیتی ہیں۔ اسٹیشن  
 کے چار بابوؤں، پانچ فلا صیوں، جیچوں کے بجاریوں اور مہابیر دل والوں  
 نے ایک میموریل وائسرائے کو بذریعہ تازہ بھیجا ہے۔ لیکن دوست! یہ تو  
 میں بھول ہی گیا تھا۔ میں نے تمہیں پہچانا نہیں۔ شکل بہت بدلی ہوئی معلوم  
 ہوتی ہے۔ کہیں خفیہ پولیس میں تو تہتیں؟“

”ہو ہو ہو...“

جے رام نے اپنے مخصوص انداز میں ہنستے ہوئے کہا۔

”میں تو کھٹ کا بیٹا ہوں۔ مہھلا بیٹا۔ پہچانا ہے۔ جس کا بیٹا

اور چھوٹا بھائی دونوں لاہور کے پاگل خانے میں ہیں۔“

اس معمولی سے اشارے سے مادھو لال کو سب پر یاد آ گیا۔ ہماری

دنیا ہوشیاروں کی نسبت پاگلوں کو زیادہ یاد رکھتی ہے۔ اور زندہ لوگوں کی

نسبت مرے ہوئے لوگوں کے گناہ فوراً بخش دیتی ہے۔ مادھو لال بولا۔  
 ”میں آؤ کھٹ کے سب بیٹوں کو اچھی طرح سے جانتا ہوں۔ بچپن  
 میں ہم نے ایسی شرارتیں کی ہیں جن کی یاد آئی ہے تو شرم سے گردن جھک  
 جاتی ہے۔ لیکن وہ بچپنا تھا نہ آخر۔۔۔ کہو، تم اتنے دنوں رہے کدھر؟“  
 اس وقت اندھیرا پوری طرح اپنا تسلط جما چکا تھا۔ آسمان پر ستارے  
 اور شید میں چمگا ڈر ایک دوسرے کا پیچھا کرتے ہوئے تھک چکے تھے۔ اور اٹلی  
 کے درختوں میں اپنے گھر وندے یا لوہے کے کسی گارڈر کے ایک کنارے لٹک  
 گئے تھے۔ ٹھٹھ جانے والی روشنیاں ایک کہکشاں سا بن گئی تھیں۔ جے رام نے  
 حکیمانہ انداز میں اپنی ٹھوڑی تھامتے ہوئے کہا۔

”میری کیا پوچھتے ہو بابا! بہت سے کھیل کھیلے ہیں، بہت چوٹیں کھائی ہیں،  
 اب آخر میں ایک بڑے وکیل کا منشی تھا۔ اس سے پہلے عدالت میں ریڈر تھا۔ یہ  
 قانون تو میری انگلیوں کی پوروں میں ہے۔“

”یہ بات ہے؟ مادھو لال نے مصحفی کے لیے ہاتھ پھینکتے ہوئے کہا۔ ”میرا  
 ایک عزیز تین سو دو میں دھر لیا گیا ہے۔۔۔ آؤ۔۔۔ کیا نام ہے تمہارا؟“  
 ”جے رام!“

”جے رام!۔۔۔ اچھا تم اپنی کہہ لو۔ پھر میں اس مقدمہ کی کہوں گا۔“  
 ”نہیں نہیں۔۔۔ تم کہو: جے رام نے مادھو کو تھپکتے ہوئے کہا اور پھر  
 خود ہی بولنے لگا۔ ”کسی کے سامنے اپنی موچھ نیچی نہیں ہونے دی۔ یہ اپنا دھرم  
 نہیں۔۔۔ اور نہیں تو آج ایک پورے ضلع کا بحسٹریٹ ہوتا۔“

مادھو لال نے پلٹ کر اپنے سامنے بظاہر ایک رذیل آدمی کو دیکھا جو  
 اپنی لاکھی سے زمین پر حلقے بنا رہا تھا اور تیکھی اور مسلسل نظر سے اسے گھور رہا

تھا۔ اس نظر کی تاب نہ لاتے ہوئے مادھو لال نے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ اس بظاہر رذیل آدمی کی باتوں میں کچھ ایسا خلوص تھا کہ قائل ہوتے ہی بنتی تھی۔ جے رام نے ایک سرد آہ بھری اور ناک کے رقیق لعاب کو کیبل کے ایک کونے سے پونجھتے ہوئے کہنے لگا۔

”لادی کا بیل جب بھاگے گا، گھوم پھر کر لادی کے پاس آکھڑا ہوگا۔ بڑے منصف سے لڑائی ہوئی تو ریڈری چھوڑ کر وکیل کا منشی ہو گیا۔ یہ میرا آخری پیشہ ہے۔ اس سے پہلے میں بیس بیسے اختیار کر چکا ہوں۔“

مادھو لال نے بات کاٹتے ہوئے کہا ”تمہیں بھوک تو لگی ہوگی جیرام؟“

جیرام نے پیٹ پر ہاتھ مارا اور بولا ”ہاں، ہے تو۔۔۔ بھوک سے ناف کے نیچے ایک کھلبلی بھی ہوئی ہے اور یوں ڈکارا ہے ہیں، جیسے برسوں کے لیے کھا لیا ہے۔“

”اچھا تو چلتے ہیں۔۔۔ چلو۔۔۔“ اور مادھو لال نے اپنے پوربی خلاصی کو آواز دیتے ہوئے کہا ”اے سکھوئی۔ بندریا کے نندوئی۔“

ایک کالا سیاہ آدمی جس کی آنکھیں مشعل کی طرح روشن تھیں قریب آنے لگا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے اندھے کنوئین پر وہی لٹک رہا تھا۔ اور یوں بھی لنگور بندریا کا نندوئی ہوتا ہے۔ سکھوئی لیمپ روم سے ہاتھ میں مٹی کے تیل اور راکھ سے آلود ایک چیتھڑا لیے ہوئے آکھڑا ہوا اور بولا:

”کیا ہے سرکار؟“

”دیکھو، لالہ کی گٹھڑیاں اٹھا لو۔ پھینک دو اس چیتھڑے کو؟“

سکھوئی نے ایک گٹھڑی اٹھائی۔ غم کی گٹھڑی۔ مادھو لال نے کم از کم وقتی طور پر اٹھالی تھی اور جے رام کچھ بیک سا محسوس کرتا ہوا ساتھ ہولیا

راستے میں بہت دیر خوشی رہی۔ کبھی کبھی اندھیرے میں پتھروں سے ٹھوکر کھانے پر "اوہ" کی آواز پیدا ہوتی۔ آخر جیرام بولا۔۔۔

• دراصل میں دنیا سے بہت اچاٹ ہوں باور سے! بہت اچاٹ ہوں۔ اس لیے میں ادھر بھاگ آیا ہوں۔ میں نے بہت دولت بر باد کی ہے۔ لیکن کچھ بن نہیں سکا ہے۔ میری طبیعت میں چند ایسے مستقل نقص پیدا ہو گئے ہیں جنہیں میں کوشش کے باوجود ٹھیک نہیں کر سکا۔

مادھورام سنتا گیا۔ جے رام بولتا گیا۔ ایک مقدس گرنتمہ میں لکھا ہے۔۔۔ "کتے ہی جو بن ہیں تو محبت کے بغیر مر جھا گئے ہیں" اور دراصل میری عادتوں، میری سب بے اعتدالیوں، میرے نشے، میرے تلون سب کا کارن یہی ہے کہ میرے ساتھ کسی نے محبت نہیں کی۔ میں نہیں جانتا آج تک نہیں جانتا محبت کسے کہتے ہیں۔ کرتار پور میں تیس سال پہلے ایک واقعہ پیش آیا تھا۔۔۔ ایک لڑکھان لڑکی میری طرف دیکھ کر مسکرائی تھی۔ لیکن چھوڑو اس بات کو باور سے۔ اب تک تو وہ آٹھ دس بچوں کی ماں ہو چکی ہوگی۔ اور کیا معلوم وہ اب کرتار پور میں ہو بھی یا نہیں!

اس دوران لا محدود فضا میں چند غا کے پیدا ہونے شروع ہوئے اور سکھونی خود بخود ایک جگہ پر جا کر رُک گیا۔ یہ کمرہ پتھروں سے بنے ہوئے ایک خوبصورت کوارٹر کا ذیلی حصہ، اس کا ضمیمہ محض تھا جس کا ایک دروازہ غائب تھا۔ دوسرا دروازہ کھلنے پر سیل اور سٹی کا تعفن باہر کی طرف لپکا۔ اس کمرے کے اندر ایک اور دروازہ اسٹیشن ماسٹر کے کمرے میں کھلتا تھا۔ جس کی درز میں سے روشنی کی ایک گھٹی ہوئی کرن کمرے کے غا کی ذرات کو تیرتے ہوئے دکھا رہی تھی۔ دوسری طرف سے باور سے کی لڑکھان لڑکیوں کی غٹروں کی بھی سنائی دے

رہی تھی۔ کمرے کے ایک طرف پیالہ بھی ہوئی تھی۔ یہاں مادھولال اپنی گائے باندھا کرتا تھا جو ان دنوں بیانے کے لیے باہر بھیج دی گئی تھی۔ سکھوئی نے اشارہ پا کر حیران کا بستر پیالہ پر پٹک دیا اور جے رام بستر کھولنے لگا۔

جے رام کے دل میں ایک غلش پیدا ہوئی۔ کاش! اُسے بھی گھر کا ایک فرد سمجھا جاتا اور ادھر کسی نرم و گرم کونے میں جگہ دی جاتی۔ لیکن مہان نوازی بھی مرتبے کے تلوے چاٹتی ہے۔ اور وہ خاموش رہا۔

تھوڑی دیر بعد کھانا اور کھاٹا آگئی۔ جے رام کو اپنی حالت پر رحم آنے لگا۔ اس کے تختل میں رفعت تھی۔ جس نے پیالہ کی دنیا کا خلا پاٹ دیا تھا۔ پاورے نے بھی کھانا کھایا اور ڈکار لیتے ہوئے بولا: "بس دال پھلکا ہی ہے جس کا مطلب تھا کہ اس کے اہتمام کا بار بار تذکرہ کیا جائے اور مزید برآں شکریہ بھی ادا ہو۔ لیکن تحسین و شکریہ میں جے رام نے کبھی بخل سے کام نہیں لیا تھا۔ باورا اور بھی زیادہ سنکرانہ لہجہ میں بولا: "بس تمہارے پانوں کی خیریت پر مانتا نے سبھی کچھ دیا ہے۔ دودھ ہے، پوت ہے، بھاگو ان بیوی ہے..."

جے رام کو یہ بات خوش نہیں کر سکتی تھی۔ اسے زندگی میں یہ سب نعمتیں یا تو میسر ہی نہیں آئی تھیں، اور جو میسر آئیں وہ وقانہ کر سکیں، وہ دوسروں کی خوشی میں خوش نہیں ہو سکتا تھا۔ یہ اس کے بس کا روگ نہیں تھا اس نے ڈبیہ نکال کر کچھ پھانکا اور اپنی بے چینی کے نکاس کے لیے بات کا رخ بدلتے ہوئے بولا:

"کچھ روز گار کی کہو باورے..."

شاید اگر مادھولال مقروض ہوتا تو اس کے دل کو ایک نوع کی خوشی

ہوتی، لیکن مادھولال بولا: "میں یہاں 'سی' کلاس کا اسٹیشن ماسٹر ہوں۔ چند

مہینوں میں بی کلاس کا ہو جاؤں گا اور ایک بڑا جنکشن اسٹیشن ملے گا۔ یہاں قریب ہی ایک اسٹیشن کے لیے کوشش کر رہا ہوں جہاں سے سارے پنجاب میں سلیپر جاتے ہیں اور مونگ پھلی۔ فی سلیپر چار آنے اور فی بوری مونگ پھلی دو آنے ملتے ہیں۔

جے رام نے گھبرا کر بات کاٹ دی۔ "ابھی تمہاری نوکری کافی ہو گی۔ مادھولال بولا۔ "ابھی بہت کافی ہے۔ مجھے امید ہے کہ ریٹائر ہونے سے پہلے میں نے کلاس کے اسٹیشن پر قائم مقام اسٹیشن ماسٹر تو ہو سکوں گا۔ اس کے بعد مادھولال اٹھ کر چلا گیا۔ جے رام کی بھی یہی خواہش تھی۔ وہ پہلے ہی اپنا منہ چھپانے کے لیے بستر ٹٹول رہا تھا۔ سونے کی کوشش کے باوجود جیرام کو نیند نہ آئی۔ اسے مادھولال سے حسد پیدا ہو گیا تھا۔ اسے اپنی دنیا اس بیل کی مانند دکھائی دینے لگی جو بڑے سے درخت پر چڑھتی ہے، بڑھتی ہے لیکن پڑوایا، پچھوایا کے پہلے ہی جھونکے پر سڑ جاتی ہے۔

گیلی پیال کی سڑاند سے جے رام بہت بیزار ہوا۔ صبح سویرے کچھ آنکھ لگی، تو مرغیوں کی غڑغڑوں نے اسے جگا دیا۔ جے رام اٹھا اور اس نے دروازے کے قریب ہو کر باہر جھانکا۔ دور کرین پتھروں کا دانہ دنکا چگ رہا تھا اور اس کے ارد گرد مزدوریوں چمٹے ہوئے تھے جیسے پڑ مغز ہڈی کے ارد گرد چیونٹیاں جمٹ جاتی ہیں۔ کچھ بندر گھنے پیل سے مسافر خانے کی چھت پر اتر آئے اور اسے وارنوف کی تجربہ گاہ بنا دیا تھا۔ نیچے مسافر اسٹیشن کے اندر داخل ہونے کے لیے ایک دوسرے میں الجھ رہے تھے، حالانکہ کوئی خاص بھیڑ نہ تھی۔ لیکن یہ افراتفری مسافروں کی زندگی کا ایک جزو بن چکی تھی۔ باہر نکلتے تھے تو افراتفری دکھاتے تھے اور اندر آتے تو سراسیمگی کا اظہار کرتے۔ مادھولال

کے سامنے ہی کسی نے ایک گنوار کو دھکے دے کر چند لائیں اور گھونسنے رسید کیے۔ لیکن وہ شخص پھر سے ہمارے ہاندھ آنکھیں جھپکاتا ہوا اسی جگہ آکھرا ہوا جیسے کچھ ہوا ہی نہیں... ۛ

جے رام کے دل میں پھر باورنے کی منظرین دُنیا اور اس کا شاندار مستقبل پیدا ہو گیا۔ ایک دم جیسے سا محسوس کرتے ہوئے جے رام اٹھا اور اپنے کپڑے لئے سمیت باہر نکل آیا۔ اس جلدی میں اس نے اپنے میزبان کا شکریہ تک ادا نہ کیا۔

باہر نکل کر وہ چند غلیظ اور تندرست پٹھوؤں کے پاس پہنچا اور بولا

”کیوں بھائی گھٹھر چلو گے؟“

پانچ چھ پٹھو جے رام کے بوجھ کے لیے دوڑے اور پھر ایک ساتھ اس پر ہاتھ ڈالتے ہوئے آپس میں لڑنے لگے لیکن اور ایک آدمی گھٹھر جانے کے لیے دکھائی دیا تو سب کے سب جے رام کا بوجھ رکھ کر اس کی طرف بھاگے اور پھر وہاں بھی وہی ہاتھ پائی شروع ہو گئی۔ جے رام پٹھوؤں کی اس حرکت سے اندازہ نہ کر سکا کہ کیوں اس کی گھٹھری پہلے تھامی اور پھر ایک ایسی پھینک دی گئی ہے۔ گھوڑی دیر کے بعد اس کی وجہ کا پتا چلا۔ پٹھو اکیلے ہی دو مسافروں کا بوجھ اٹھانا چاہتے تھے۔ ایک جسمانی طاقت کے لحاظ سے سب پر حاوی تھا۔ دوسرے مسافر کی گھٹھری لے کر جب وہ جے رام کے بوجھ کے لیے لپکا تو جیرام نے للکارا نہ خبردار! اگر اسے کسی نے ہاتھ لگایا تو

سب کے سب اس پیر فریوت کی شکل دیکھنے لگے جو کہ اب گھٹھری پر دھرنا مارے منہ میں فحش گالیاں سننا رہا تھا۔ دوسرا مسافر جانتا تھا کہ جب تک پٹھو دوسرے کے بوجھ سے لہ نہیں جائے گا یہاں سے نہیں لے گا۔ اس



نے جیرام کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

”لالہ! دے دو بوجھا اپنا۔۔۔ دیتے کیوں نہیں، آؤ چلیں!“

جیرام نے قہر آلود نگاہیں اس نئے مسافر کی طرف اٹھائیں۔ اور پھر یہ جان کر کہ یہ میرے ہی گاؤ کا آدمی ہے، چپ ہو گیا ورنہ جھپٹ ہو جاتی۔ نئے مسافر کا جگر خراب تھا۔ آنکھوں کے پے بڑے بڑے تھیلے تھے اور آنکھوں کے اندر لکڑوں کی سُرخ دیکھائی دیتی تھی۔ وہ لکڑوں کی خارش سے تسکین پانے کے لیے بار بار اپنے بے حد غلیظ کوٹ کے کفوں کو باری باری آنکھوں پر رگڑتا۔ کچھ لب بسوز کر اور آنکھیں پھیلا کر وہ پھر بولا۔۔۔ ”تھوک دو غصہ“

جے رام نے کہا ”لالہ! اگر انسان ہو تو ان بندروں کو سبق سکھانے کے لیے بوجھ یہاں رکھ دو۔ پھر اٹھے جائیں گے“

لالہ نے مان لیا اور دونوں اکٹھے بیٹھ گئے۔ جے رام بولا: ”کھٹھر میں تمہارا کون ہوتا ہے؟“

”میں بیس سال سے کھٹھر میں رہتا ہوں۔ اگرچہ میرے جیون میں تین مکان ہیں جن کا تیرہ روپیہ ہر ماہ کرایہ آتا ہے۔ پھر بھی میں کھٹھر میں رہنا پسند کرتا ہوں۔ وہاں کا پانی آنکھوں کے لیے اچھا ہے۔“

”کیا کام کرتے ہو؟“

”اماوٹ بیچتا ہوں۔ جب آسموں کی فصل ہوتی ہے تو سیکڑوں میں آم ایک بڑے احاطے میں صفوں پر بچھا دیے جاتے ہیں۔ پٹھو پانڈو دھو کر ان میں گھومتے ہیں اور اپنے پانڈو سے ان کا لمبہ بنا دیتے ہیں اور پھر اس لمبہ کو صاف کر کے اور سکھا کر اماوٹ بنایا جاتا ہے۔“

جے رام نے دورا بجن کو پانی پی کر ٹھوکر کے قریب پہنچتے ہوئے دیکھا۔ اسے

خیال گزرا کہ ابنجن ٹھوکر سے ٹکرا کر یا تو خود اُلٹ جائے گا، اور نہیں تو ٹھوکر کو  
پاش پاش کر دے گا۔ جے رام کا اندر کا سانس اندر اور باہر کا باہر رک گیا اور  
وہ اپنی گٹھڑی پر سے اٹھ کر لاٹھی کے سہارے کھڑا ہو گیا اور ابنجن کی طرف  
دیکھنے لگا۔ ٹھوکر کے قریب ابنجن کے کھڑے ہو جانے سے جے رام نے اطمینان  
کا سانس لیا اور واپس اپنے بوجھ پر بیٹھتے ہوئے بولا: "اماوٹ کا بیوپار کرنے  
والے تمہارے سب لوگوں کو جانتا ہوں!"

"کیسے جانتے ہو؟ لالہ نے پھر کفوں سے آنکھیں ملے ہوئے پوچھا:  
"میں گٹھڑی کا پاسی ہوں۔ آتو کھٹ کا بیٹا۔ چھوٹا اور بڑا بھائی پاگل خانے  
میں ہیں!"

لالہ اٹھ کھڑا ہوا اور اس نے آتو کے بیٹے سے پُر جوش مصافحہ کیا۔ وہ  
دوڑوں چند لمحوں کے بعد ایک دوسرے کو دیکھتے اور مسکراتے رہے۔ لالہ اپنا سر بھی ہلاتا رہا  
گویا اُسے کسی ذہنی الجھن کا حل مل رہا ہو۔ جیرام نے خاموشی کو توڑتے ہوئے  
کہا: "لیکن لالہ! تمہارے خاندان کے سب لوگوں میں اماوٹ کی ترشی ہوتی  
ہے۔ اور تم میں ترشی نام کو نہیں ہے"

لالہ ہنس دیا۔ جیرام نے جیب میں سے ایک تھیلی برآمد کی اور اس میں  
سے تمباکو نکال کر ہتھیلی پر ملا اور پھانک گیا۔ اس وقت آسمان صاف تھا۔ اور  
سورج نکل آیا تھا۔ جس کے نمودار ہوتے ہی دُھند اُترنے لگی اور اس کی وجہ  
سے سورج اپنی آب و تاب کھو کر ایک کانسٹی کا تھاں دکھائی دینے لگا۔ لالہ  
کی رعشہ دار آنکھوں کے لیے یہ روشنی بھی زیادہ تھی۔ اس نے ماتھے پر ہاتھ  
رکھ لیا اور جے رام کے کریدنے پر بولا:

"گھی اور اماوٹ کے صنب بیوپاری گندے رہتے ہیں۔ ان کے ارد گرد

کھیاں بھینھنا تی رہتی ہیں۔ یہ سب ٹھیک ہے لیکن اس اماوٹ کی بدولت میں نے تین چار مکان بنالیے ہیں اور یہاں سے کئی سن اماوٹ ہر سال شہر لاہور کو لے جاتا ہوں۔ کل ہی واپس آ کر تین بیسی کم دو ہزار کی وصولی کرنے جا رہا ہوں، جے رام نے یک لخت لالہ کی باتوں میں دلچسپی ختم کر دی اور کھٹھڑ جانے کا ارادہ ملتوی کر دیا اور بولا: "لاہور ہے۔۔۔۔۔ لاہور بہت بڑا شہر ہے۔۔۔۔۔ وہاں سب کچھ یک جاتا ہے۔ غلاظت، اماوٹ سبھی کچھ یک جاتا ہے۔"

پٹھو کچھ دور کھڑے بے صبیری سے اُن دونوں کی باتیں سن رہے تھے کچھ مایوس ہو کر چلے گئے اور کچھ اپنے نوکروں کے سہارے کھڑے رہے۔ دور سے ایک اور سواری دکھائی دی اور سب کے سب اس کی طرف دوڑے جے رام نے پھر نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا:

"چہ چہ۔۔۔۔۔ لالہ تم بہت امیر ہو گئے ہو۔ لیکن اس امارت کا فائدہ ہی کیا ہے۔۔۔۔۔ تمہاری اپنی پوشش۔۔۔۔۔ یہ دیکھو، کمانی تو بازاری عورتوں کی بھی بہت ہوتی ہے، لیکن پیسے پیسے میں فرق ہے نا؟"

لالہ نے آنکھوں پر روک بناتے ہوئے اس بات کی تصدیق کی کہ یہ آ تو کھٹ کا بیٹا بول رہا ہے اور پھر اپنے کپڑوں کی طرف دیکھتے ہوئے بولا: "تم چاہتے ہو، تمہیں ساری بھی لے اور چٹری ہوئی بھی۔۔۔۔۔ یہ دو باتیں ناممکن ہیں۔"

اس اثنا میں ایک پٹھو تیسرے گاہک سے بھی مایوس ہو کر لوٹا لالہ نے جلدی سے اسے اپنا بوجھا اٹھوا دیا اور کچھ دور ہا کر کھٹھڑ گیا۔ پیچھے کی طرف گھوما اور ایک پورا پنجا اور ایک انگلی دکھاتے ہوئے بولا: "اس فصل میں چھ سو سن اماوٹ شہر لے جاؤں گا اور ہو سکا، تو ایک ہزار۔۔۔۔۔" اور ایک ہزار کہتے

ہوئے اس نے اپنے دونوں بیٹے پوری طرح پھیلا دیے اور اپنا بوجھ آپ ہی اٹھائے  
گھائی کی طرف بڑھا۔ جیرام اس کے غائب ہونے تک اس کے میزان سے بازو  
کبھی ایک طرف سے بیٹے اور کبھی دوسری طرف سے اوپر ہوتے ہوئے دیکھتا  
اور منہ میں کچھ بڑبڑاتا رہا۔ حتیٰ کہ لالہ ایک چٹان کے پیچھے غائب ہو گیا۔

اس وقت انجن واپس لائٹوں کے ایک جال میں اٹھنے کے لیے جیون  
دو آب ٹرمینس چھوڑنے کے لیے تیار تھا۔ وہ ادھر رخ کیے ہوئے تھا۔ بدھ  
سیکڑوں جنکشن اسٹیشن اور سی کلاس کے اسٹیشن ماسٹر تھے، اور ہر سال  
ہزاروں من اماوٹ کی کھپت تھی۔ انجن ایک خوش بلی کی طرح خرخر کر رہا تھا  
اس کی آواز کبھی اونچی اور کبھی مدہم ہو جاتی۔ کبھی ایک اونچی سیٹی بازار میں کھینے  
والے بچوں کو ڈرا دیتی، یا خلاء صیوں ہنگل مینوں کے نڈرنے انجن کی نقل میں  
سیٹیاں بجانے لگتے اور ایک دوسرے کی قمیص پکڑ کر ایک ہاتھ سے پشن بناتے  
ہوئے چلنے لگتے۔

جے رام نے اس پریشانی کے عالم میں گھٹری اٹھائی اور مسافر خانے کی  
طرف چل دیا۔ دنیا کتنی وسیع اور لامتناہی تھی لیکن اس پر اس کا ظرف کس  
قدر تنگ ہو گیا تھا۔ مسافر خانے میں بھیڑ صاف ہو رہی تھی۔ کچھ دیر بعد ایک  
خوش پوش سامنے آیا اور بولا:

” میں ٹکٹ لینا چاہتا ہوں بڈھے! کیا میرے اس اپنی اور بستر کا خیال  
رکھو گے؟“

جے رام نے اس خوبصورت چھوکرے کی طرف دیکھا اور اس سے پہلے کہ  
وہ اثبات میں اپنا سر ہلائے، نوجوان اپنا سامان رکھ کر جا چکا تھا جے رام  
ایک سٹیج خادم کی طرح ان چیزوں کے پاس کھڑا ہو گیا۔ وہ نوجوان کچھ دیر کے

بعد ٹکٹ لے کر لوٹا اور جے رام نے بوجھا۔

”صاحب بہادر! کدھر جا رہے ہیں آپ؟“

نوجوان نے یہ خطاب پسند کیا۔ اس نے خوش ہو کر ایک سگریٹ سلگا یا ایک ادا سے دیاسلانی کو بجھا کر پاؤں تلے مسلتے ہوئے وہ قریب قریب سارے کا سارا گھوم گیا اور بولا:

”میں بہت دور جا رہا ہوں، بڑے بہت دور۔“

”دور۔“

”ہاں دور۔ تمہارے قیاس سے پرے۔“

”کیا سان فرانسسکو جا رہے ہو آخر؟“

نوجوان نے حیران ہو کر جیرام کی طرف دیکھا اور دل ہی دل میں بڑے

تک جغرافیائی علم سے مرعوب ہوتے ہوئے بولا: ”بھئی جا رہا ہوں بابا۔“

”بھئی۔۔۔؟۔۔۔ ہے تو دور ہی؟“ جے رام سوچتے ہوئے بولا: ”سیر

کرنے کا ارادہ ہے؟“

”میں ایک فلم کمپنی میں ایکٹر بھرتی کر لیا گیا ہوں بابا۔۔۔ ابھی مجھے

ولین کا پارٹ ملا ہے۔ ولین سمجھتے ہو نا؟ وہ چھو کر اچھو عاشق اور معشوق کے

درمیان حائل ہو جاتا ہے اور جس کی لالوں اور گھونسنوں سے مرمت ہوتی

ہے۔ لیکن مجھے ان لالوں اور گھونسنوں کی کوئی پروا نہیں۔۔۔ ولین کے

بعد اگلا قدم ہے ہیرو۔۔۔ میں کچھ بنوں گا، بابا تمہاری دعا چاہیے۔“

جے رام نے دعا کا ایک لفظ بھی منہ سے نہ نکالا۔ اس کی نگاہوں سے

وحشت سی ٹپکنے لگی۔ اس نے جنگ پکڑنے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو وہ کانپ رہا

تھا۔ نوجوان نے اپنا اٹیچی، ٹرنک اور بستر ایک پٹھو سے اٹھوایا، اور پھاٹک کے

بیچے غائب ہو گیا۔ کچھ دیر کے بعد پل پر اس کی ٹانگیں چلتی ہوئی دکھائی دیں  
 جے رام چند لمحے گو گو کے عالم میں کھڑا رہا۔ اچانک ایک خیال کے آنے سے  
 اس کے منہ پر رونق آگئی۔ اس وقت گاڑی چھوٹنے کی گھنٹی بجی  
 جے رام بھاگا اور ٹکٹ گھر کے سامنے جا کھڑا ہوا اور بہت سے پیسے نکال کر  
 کھڑکی میں بکھیر دیے ٹکٹ با بو بولا۔

”مکہر جاؤ گے بڑھے؟“

”کر تار پور۔۔۔ کر تار پور۔۔۔“ جے رام نے دہرایا اور گاڑی

چھوٹنے سے چند ہی لمحے پہلے جے رام گاڑی میں سوار ہو گیا۔ اس وقت  
 جب کہ ٹھوکر میں یکہ و تنہا کریں، بجو یا اور اس کی نظروں سے غائب ہوا  
 اُسے زندگی کافی دلچسپ دکھائی دینے لگی تھی۔

# کشکش

بڈھا موہنا مر رہا تھا۔ اس کی آنکھوں کے کولوں تک صفت کی بن  
مانگی ہلدی بکھر گئی تھی۔ چھت، الگنی، سنڈاس، بچوں اور سایوں کی طرف دیکھنے  
کی بے بضاعت، بے سود کوششوں سے ظاہر تھا کہ اس ساون سوکھے نہ  
اساڑھ ہرے جسم میں زندگی کی سرس و ہوا ابھی تک باقی ہے۔ بڈھے کی نگاہ  
واپس سے ۶۷ یروں کو ہمدردی نہیں تھی، نفرت تھی۔ آخر جو آدمی ہفتے بھر سے  
روز جیتا روز مرتا ہو، خدا جانے اس کی کون سی نگاہ نگہ واپس ہوتی ہے۔

یاہرا سلحہ خانے کے برابر ایک تنہا ٹرام، شرابی کی طرح لڑکھرائی کھڑ  
کھرائی شور مچاتی گزر رہی تھی، یا قریب ایک رکشا قلی زور زور سے اپنے گھنٹھرو  
رکشا کے بھوں پر مار رہا تھا۔ اسے اپنے سیپ کا موتی اگلنے کی جلدی تھی۔ اور  
وہ یوں تیزی سے بھیڑ کو چیرتا ہوا جا رہا تھا جیسے تیز قصابی چھری کراچی کی بھلی  
کے گداز جسم میں سے گزر جائے "باچو، باچو، ہے پوسے... ایک ہجوم ہنستا، کھیلتا  
روتا، گھر، تھیٹر اور جہنم کی طرف جا رہا تھا۔ اور موہنا کا بتیس سالہ بیٹا جا اپنے  
دوڑوں بیٹوں اور ادھی بیٹی یعنی لنگڑی چھو کڑی کو بچانے کے لیے ایک پھٹے ہوئے  
ڈھول کی آوازیں چینتا۔ حتیٰ کہ اس کی رفیقہ حیات جونکے پیدا کرنے اور پھر



انہیں فحش گالیاں دینے کی حد تک ہی راجا کی رفیقہ تھی، اپنی رفاقت کا پورا حق  
 نبھاتی تھی۔ اوتوں مارو، بیٹھے کے توڑو اٹھ جاؤ دنیا سے، ارے سارے  
 جانے کے گلٹی نیکل ری، اور ان کے گلٹی بھی تو ناکلتی... گویا بچے شرام کے  
 بچے آکر تو نہ مرے، طاعون اور ہیضہ انہیں بھلے ہی لے جائیں۔

راجا نے ایک طویل سی جمائی لی اور آخ— کی ایک آواز کے  
 ساتھ اپنے اٹھے ہوئے بازوؤں کو بچے گرا دیا۔ دو جھوٹے بھائی، ایک  
 بہنوئی اور ایک مسلمان پڑوسی پھکی رات سے جاگ رہے تھے۔ ان کی آنکھیں  
 دکھ رہی تھیں۔ پٹوال سے پڑے دکھائی دیتے تھے اور پانی بے تماشہ بہہ  
 رہا تھا۔ جیسے آنکھوں کی دکھتی رگوں پر کوٹا ہوا پھونکا جلا جست باندھ دیا  
 گیا ہو۔ ان لوگوں میں سے جب کوئی کھوڑی دیر کے لیے اونگھ لیتا، تو یوں  
 محسوس کرتا جیسے جست کے باوجود اس کی آنکھوں پر بالائی باندھ دی گئی  
 ہے۔ سب کی خواہش تھی کہ موہنا ایک طرف ہو۔ اب جب کہ وہ ہالیٹوں کا تلہ  
 بھی نہیں لگاتا، کچھ اس لیے کہ بول و براز بھی چار پائی پر ہوتا اور پھر اس لیے  
 کہ چار پائی پر مرنا بیٹوں کے لیے بھاری ڈنڈ تھا۔ اس ہفتے میں چھ سات بار  
 موہنا کو زمین پر رکھا گیا اور اس کے ہاتھوں پر آٹے کا دیا رکھ کر اسے  
 سورگ کا راستہ دکھانے کا کوشش کی گئی۔ ابھی کانوں کی لوہیں سپاہ اور سرخ  
 نتھیں اور روشنی آریا چلی جاتی تھی، اور ناک کے قریب کانسہ کی تھالی کرنے  
 سے کچھ مرطوب سے بخارات جم جاتے۔ موہنا کے داغ کے کسی کو نے میں  
 امید اور لواحقین پر مایوسی سی چھا جاتی۔ زمین کچی تھی۔ ابر ٹھنڈی۔ اس پر  
 موہنے کو رکھنے سے یوں ہی جان نکل جاتی۔ موہنے کا مرنا تو سب چاہتے  
 تھے لیکن اذیت دینے سے گھبراتے تھے۔ کچھ گندم اُبال رکھی تھی، کچھ دان



پہلے وہ ٹھنڈے تھے۔ اب یوں معلوم ہوتا تھا جیسے گرم ہو رہے ہیں۔ اور ٹخنوں پر ایک شریان ایک لخت حرکت کرنے لگی۔ قرآن پاک کی قسم وہ بولا "موہنا با با جی وہا ہے۔ میں شرط بدتا ہوں اور پھر جیب کے پیسے بجائے ہوئے بولا "بولو کتنے کتنے"۔

بیٹے ایک دفعہ پھر ہنس دیے اور پھر ایک پڑ مردگی سی اُن پر چھا گئی۔ راجانی نے جھاڑوا اٹھائی اور سنڈاس اور پھوس کی دیوار کے درمیان کا کچا حصہ صاف کرنے لگی۔ راجانی حلقے کے تھانے دار کے لیے ٹین کا حمام بنایا تھا۔ ڈھا پختہ گول کیا ہوا کونے میں پڑا تھا۔ انگلیٹھی کی ٹوپی بھی بن گئی تھی۔ اب سب کچھ تپائی پر رکھنا تھا اور لوہے کی ریشیں لگانا تھیں۔ تپائی جو کی کے قریب انگڑائیاں لے رہی تھی۔ ایک پیادہ سیاہی کئی دفعہ ہو گیا تھا لیکن اس نئی مصیبت سے جھٹکارا حاصل ہوتا تب لوتھین کی ننھی ننھی کزنیں ہاتھوں سے اٹھا راجانی سنڈاس کے پاس ڈھیر لگانے لگی۔ کھٹیک سنڈی کے نواح سے ایک گھاگھا آیا کرتی تھی اور سب بکرا ہوا ٹین اور بے کار و مصرف لوہا کسی بیدار ملک کو پہنچانے کے لیے سمیٹ لے جاتی۔

پہلی ٹرام نے مسجد کے قریب اپنے مسافر چھوڑے۔ کچھ بیٹھے ہوئے تھے اور کچھ اس سے بھی پرے جانے والے تھے اور کچھ سوار ہونے کو تھے۔ ٹرام چلانے والا اٹھی پر ہاتھ رکھے فلا میں گھور رہا تھا اور دوسرے ہاتھ سے بلا ضرورت گھنٹی بجا رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ اس کے بنانے والے نے خوب اس کا مضحکہ اڑایا ہے۔ بس سارا دن شہر میں چکر لگانے رہتا۔ اور پھر وہیں۔ کبھی ہوتا ہے کہ کوئی کتا پیچھے آکر سر جاتا ہے اور پھر منتظران کمیٹی کو "نیگلینٹ ڈرائیونگ" کے سلسلے میں بیان دینے پڑتے ہیں۔ اس ہموار سا کن

زندگی سے موت اچھی ہے۔ کلپ کلپ اور چیکر بے تماشہ ٹکیٹیں مسافروں کے ہاتھ میں ٹھونس دیتا ہے۔ بس اس کا کام ہے ٹکیٹیں دینا اور پھر ٹکیٹ سے دام وصول کر لینا۔ اس کی زندگی کا ارتعاش یہی ہے کہ پانچ سال سے بڑا بچہ بلا ٹکٹ سفر نہ کرے۔

اور اس کی ساری زندگی میں شاید ہی کوئی حسین واقعہ پیش آیا ہو گا۔ ایک دفعہ بیناری چوک سے ایک کنبے کا کنبہ چڑھا، جس میں ایک لڑخیز لڑکی بھی چڑھی۔ ماں باپ اس لڑکی کو بلا ٹکٹ لے جانا چاہتے تھے۔ اس نے بھئی۔ یہ تو بچہ ہے۔ ماں باپ چلائے "دیکھو... بھلا یہ لڑکی جو ان ہے؟" یہ تو زمین میں مفت سفر کرتی ہے۔ چیکر کہنا چاہتا تھا "کیا یہ جو ان نہیں ہے؟" دیکھو... لیکن وہ جھینپ گیا اور پائیدان اور سیٹوں کے درمیان پاؤں جمائے کھڑا لوگوں کے فیصلے کا انتظار کرتا رہا۔ ماں باپ نے دو پیسے بچاتے کے لیے چھو کڑی کو دو سیٹوں کے وسط میں کھڑا کر دیا اور نمائش شروع کر دی۔ دیکھو یہ جو ان ہے؟... دیکھو... ایک لڑخیز جو ان نے کھڑکی سے سر باہر نکال کر اپنے ساتھی سے کہا "بھئی اس طرح تو پتا نہیں چلتا اور اس دن چیکر کو زندگی کچھ بامعنی معلوم ہوئی۔ پھر کوئی ایسا واقعہ پیش نہ آیا۔ اس کلپ کلپ اور چیکنگ کو اس نے زندگی کا ایک حصہ تو بنا لیا تھا لیکن اس کے باوجود وہ اس سے بے طرح غیر مطمئن تھا۔ شاید ایک اور واقعہ بھی پیش آیا تھا۔ ایک عورت اپنے خاوند کو چھوڑنے آئی تھی۔ اتنے مسافروں کے سامنے وہ اپنے راجا سے بات نہیں کر سکتی تھی۔ راجا کسی دوسرے دیش میں جانے کے لیے سٹیشن کی طرف روانہ ہو رہا تھا۔ اسباب پہلے پہنچ چکا تھا۔ عورت نے پوچھا اب کب آؤ گے؟ مرد نے اپنی انگلی آسمان کی طرف اٹھا دی اور کہا جب بھگوان

## کوکھ جلی

لائیں گے۔ اور ٹرام چل دی۔ اس کے آہنی اور چوبی پشتوں پر کسی کے آنسو دکھائی نہیں دیتے تھے۔ وہ عورت بے بسی کے عالم میں اپنی کھوکھلی بے کار منگاہوں سے سڑک پر بچھی ہوئی لوسے کی چار لکیروں کی لا محدود تنہائی دیکھتی رہی۔

اب رانی بھی سرہانے رکھ دی گئی تھی۔ تین گھنٹے اور بڑھا بے حس و حرکت پڑا رہا۔ اب کپٹی کے پاس ابھری رگ پھر کٹنے لگی۔ موہنا کے منہ میں پانی کا ایک چھوڑا لایا گیا۔ گرد گرد کی ایک آواز آئی اور اس کے بعد موہنے نے پانی پی لیا۔ راجا نے اپنا ہاتھ اس کی نبض پر رکھا۔ نبض چل رہی تھی اگرچہ ہولے ہولے۔ اس کے بعد یکلنت جیسے سب کچھ ساکن ہو گیا۔ پیشانی گرم تھی اور پھر وہ بانس کی سی ٹانگیں بھی حرکت میں تھیں۔ راجا نے برا فروختہ ہو کر کہا:

”بابا کور کھ دو چار پانی پر“

”کیسے رکھ دیں چار پانی پر“ راجا نے بولی۔

”کیسے رکھ دیں؟ راجا نے کہا“ جیسے اسے پیچھے رکھ دیا ہے اب یہ نہیں

مرے گا۔۔۔ یہ ساری زندگی نہیں مرے گا۔

”اور ڈنڈ کون دے گا جو مر گیا چار پانی پر؟“

راجا نے خشمگین ہو کر بھائی پر ہاتھ مارا اور بولا ”ڈنڈ میں دوں گا۔ ڈرگا

مائی کی قسم یہ بڑھا کبھی نہ مرے گا۔“

چھوٹے بھائی چاہتے تھے کہ بابا ٹنڈے فرش پر محض ٹنڈک کی وجہ

سے نہ مرے لیکن چار پانی پر مرے کے ڈنڈے وہ بھی گھبراتے تھے بھائی کے

چھاتی ٹھوکنے پر وہ بہت خوش ہوئے۔ راجا کے جسم پر سے ایک پٹی پڑانی

بیوندگی چادر علاحدہ کرتی ہوئی راجانی بولی۔

”ہم تو کبھی ڈنڈ نہیں دینے کے۔ ہماری جندگی ہی ڈنڈ دینے میں گجر گئی۔ چھوٹوں کو بڑا کیا، بیاہا۔ اب آنکھیں دکھاتے ہیں۔ جو کسی سے بیوندہ دھاما لیا وہ یہ دینے ہار نہیں۔ اب چار پائی کا ڈنڈ دے، اتنا امیر آیا ہے نا!“

پھر راجانی نے راجا کو چڑاتے ہوئے چھاتی پر ہاتھ مارا۔ جھٹ جھاتی بچ اٹھتی ہے: ”مسلمان پڑوسی اشارے سے ان کو بک بک جھک جھک سے منع کرنے کے علاوہ سنہ میں کچھ ورد کر رہا تھا۔ کچھ دیر کے بعد ان کی طبیعت اکتا گئی۔ وہ کوئی فرض پورا کر رہا تھا، اسے بار بار اپنی زخمی گھوڑی یاد آجاتی تھی جس کی جان نہیں نکلتی تھی اور اس کی بیوی اور بچے کھان کے قریب کھڑے رو رہے تھے۔ آخر راجانی نے کسی کو بلا کر گیتا کے اٹھارویں ادھیائے کا پانچواں اور ہوں ہی پانچواں کرنے والے آخری شیدوں پر پہنچے گھوڑی نے جان دے دی۔ اور اب جب کہ موہنا گھوڑا بلکہ گدھا جس نے ساری زندگی بار برداری اور ٹین کوٹنے کے علاوہ کچھ نہیں کیا تھا سر رہا تھا، تو مسلمان پڑوسی کو بھی لازم تھا کہ ان کی مدد کرے۔ لیکن اس بار شلوک بھی کارگر نہ ہوئے۔ رانی سرہانے سے لے کر دروازے تک بکھر گئی۔ آخر بہت دیر بعد جب سب نے مل کر موہنا کو چار پائی پر لٹا دینے کا فیصلہ کیا اور اسے اپنے بازوؤں میں اٹھایا تو اس کی پتلیاں پھر گئیں اور وہ فرش اور چار پائی کے درمیان ہی مر گیا۔ اس وقت شام ہو چکی تھی۔ موہنا کا مقدر تھا کہ وہ زمین پر مرنا نہ آسمان پر۔ اس وقت دن تھا نہ رات نہ۔ راجا نے چار پائی کے نیچے گھس کر ایک بڑا سا سر کندہ نکالا۔ اس کو چھلکے سے صاف کیا اور لاش کے برابر کا ناپ کر اسے موہنا کے پاس رکھ دیا تاکہ ماپ رہے اور رات کو مردے کے جسم میں کوئی شیطان روح نہ

## کوکہ جلی

داخل ہو جائے۔ اس کے بعد وہ خود بخود جھینپ گیا۔

”کب لائے تھے تم سرکنڈہ راجا بھیا؟ چھوٹے بھائی نے پوچھا۔

”ابھی لایا ہوں۔ راجا نے سرگھا جھوٹ بولتے ہوئے کہا ”میرا مطلب ہے ابھی ننھوا کے ہاتھ منگوا یا ہے۔“ سب کھلی مار کر ہنس پڑے۔ یہ سرکنڈہ دو بیٹے سے یہاں پڑا ہوا ہے۔ اتنی دیر سے ان لوگوں کو موہنا بابا کے مرجانے کی توقع اور خواہش تھی اس کے بعد راجا ثابت کرنے کی کوشش کرنے لگی کہ اس کا راجا پھوس کے لیے نمونہ لایا تھا۔ مگر سب بے سود۔ کھلی اور بھی اُوچی ہو گئی۔

اگلی صبح محلے والوں کی راستے سے بابا کو بڑا کرنے کا فیصلہ ہوا۔ آخر بولتوں والا آدمی، زندگی کے سب فرائض سے سبک دوش ہو چکا تھا۔ اس کا جلوس نکالنے سے بڑا کرنے سے بیٹوں ہی کی عزت تھی۔ بہوؤں کی مانگ میں سیندور ڈالا گیا حلوان کشمیرے کی چادر، کفن اور جھنڈیوں کے لیے چندہ اکٹھا کیا گیا۔ چھوٹے بھائی نے راجا اور بیٹھلے کی نسبت زیادہ روپے دیے اس کے بعد جھوٹ کے لیے جٹ، چھوہارے اور بیٹھے چنے وغیرہ منگوائے گئے اور صبح بوان اٹھایا گیا۔

— آج پھر ٹرام والوں کے لیے ایک حسین واقعہ تھا۔ ایک بوان شمشان کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس کے آگے گھنٹیاں بچ رہی تھیں اور پیچھے کپڑے رنگے ہوئے سر منڈائے دو تین آدمی تھے اس کے ساتھ دوسرے سرد اور عورتیں مل کر ایک گانا گارہی تھیں۔ یہ گھنٹی اور یہ سواریاں اور یہ جنازہ بردار! گویا یہ جلوس بھی ایک سُست رفتار ٹرام تھی جو کہ بغیر ریل کے ایک معین راستہ پر جا رہی تھی اور سارا دن شہر کا چکر لگانے کے بعد شمشان کے باہر رُک جاتی تھی۔ کچھ سائیکل والے اتر پڑے۔ ایک صاحب نے اپنا ہیٹ اٹھایا



ایک مسلمان جو بیٹھا تھا کھڑا ہو گیا۔ ٹرام والے نے ایک لمحہ کے لیے بریک لگائے اور فلا کی بجائے سرخ حلوان اور کشمیری چادر میں لپٹے ہوئے جسم کی طرف دیکھنے لگا اور سوچنے لگا۔ اس بوڑھے کے اپنے بچے اس کا مذاق اڑا رہے ہیں۔

اس وقت بوان کے اوپر سے بیٹھے جنوں اور باداموں کی چھوٹ ہو رہی تھی۔ کبھی کبھی کوئی بادام ٹرام میں بھی آگرتا۔ ایک عورت نے اپنے بچے کو ٹرام میں بٹھا کر بچے اتر پڑی اور کچھ بیٹھے چنے ہاتھ میں لے آئی اور واپس اپنے بچے کے قریب آتے ہوئے بولی۔ بیٹا، اے کھالے، تیری عمر بھی اتنی لمبی ہو جائے گی۔ اس بوڑھے کی عمر سے بھی جیادہ۔۔۔

ٹرام کے ڈرائیور، چیکر اور زندگی سے بے حد غیر مطمئن و مایوس ایک بابو نے عورت کی اس حرکت کی طرف دیکھا اور پھرتینوں نے ایک دم اچک کر بوان پر سے گری کے جٹ اور چھوہارے اتار لیے اور رغبت سے انہیں کھانے لگے۔ اس کے بعد "پل میرے بھائی" کی آواز آئی اور ٹرام لائٹوں کے ایک جان میں اٹھنے کے لیے چل دی۔۔۔

## گالی

چشمی رساں کچھ نئے تھے اور کچھ پڑانے۔ لیکن ان سب لوگوں کا بلا لحاظ مذہب و ملت ایک قبیلہ سا بن چکا تھا۔ ان میں رحمت نورا اور پرتاپ سنگھ کی آپس میں گھاڑھی چھنتی تھی۔

”۱۳۴ الف نہیں آیا بڑا پرتاپ سنگھ نے دن بھر کے کام کے بعد اپنی ”داپسی“ میز پر بکھرتے ہوئے کہا۔

خواجہ — کلرک نے نفی میں سر ہلا دیا اور آنکھ کے ایک گوشے سے پرتاپ سنگھ کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔ خواجہ جانتا تھا کہ ٹریسٹم الف یعنی رحمت نورا اور پرتاپ سنگھ میں جب تک جوئی پیزار نہ ہوئے کسی کو کام کا نرا ہی نہیں آئے گا۔

”کھا جا۔۔۔ پرتاپ سنگھ نے خواجہ میں رحمت نورا کا ایک مہنگا بدل تلاش کرتے ہوئے پکارا۔ خواجہ کو معلوم تھا کہ پرتاپ سنگھ رند نے جان بوجھ کر اس کے نام کو بگاڑا ہے۔ اس نے ایک بڑی ہوشیار نگاہ سے پرتاپ سنگھ کی طرف دیکھا اور بولا۔۔۔

”کیوں بڑی عارش ہو رہی ہے سردار؟“

اچانک پنگ پانگ کی سی بڑی میز کے دوسری طرف رحمت نور  
اپنی شکاری جالی اور غیر تقسیم شدہ پارسل رکھتا ہوا دکھائی دیا۔ گرمی کی شدت  
سے اس کی بڑی حالت تھی۔ پسینہ کولہوں کے فراز سے نشیب میں گرتا ہوا خاک  
پتلون کے بچوں پیچ پنڈلیوں پر قطرہ بہ قطرہ ٹپک رہا تھا۔ اس کے جہلی تراش  
کے بال پگڑی کی لپیٹ میں سے باہر نکلے ہوئے تھے۔ پرتاپ سنگھ نے کہا جا،  
سے ٹکرائی مناسبت بھی نہ سمجھی اور فوراً ٹریسٹھ الف کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے  
بولاً :

”ابے رحمت نور۔۔۔ دیکھ تیری عقل کے نیچے ادھر رہے ہیں۔“

رحمت نور نے اپنی ذات اور اپنے ارد گرد سے باخبر ہوتے ہوئے اپنے بال  
پگڑی میں دبائے شروع کیے۔ بکھرے ہوئے بالوں کے متعلق عقل کے نیچے کا  
کنا یہ غالباً پرتاپ سنگھ نے۔۔۔ خدا گئے کونا خن نہ دے، اگر دے گا تو عقل  
کے نیچے ادھر دے۔۔۔ کی ضرب المثل سے لیا تھا۔ اس میں رمزیہ بھی تھی کہ  
رحمت نور چند یا سے چٹیل تھا اور یہی اس کی دکھنی رگ تھی۔

پرتاپ سنگھ نے اسی پر اکتفا نہ کرتے ہوئے کہا ”اڑھائی بال ہیں سائے  
کے اور وہ بھی تو سنبھالے نہیں جاتے؟ اور یہ سب کچھ اس طور پر کہا کہ کوئی سنے  
یا نہ سنے لیکن حق حق دار کو پہنچ جائے، کہا جا، سن کر مسکرایا تو پرتاپ سنگھ کو اس  
مسکراہٹ میں تائید اور شہ دکھائی دی۔ پھر پرتاپ سنگھ اپنے لیے کیسوں (بالوں)  
کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا :

دیکھو واگورونے ادھر کتنی عقل دڈا ہے، مگر کیا مجال کہ نیچے ادھر اہوا نظر  
آئے“

خواجہ نے دل ہی دل میں اس خوش مذاقی پر داد دی اور کہا ”تم نے اپنی

عقل کے ناخن اتر والے ہیں لیکن ٹریسٹھ الف نے نہیں۔  
 رحمت نوز نے میدان ہاتھ سے جاتے دیکھا تو بولا۔  
 ”خواجہ جی۔۔۔ سنا ہے اب سکھوں کے بارہ نہیں بچیں گے؟  
 ان دنوں حکومت نے جنگی مصلحت کی بنا پر اسٹینڈرڈ ٹائم میں ایک گھنٹے  
 کا اضافہ کیا تھا اور رحمت نوز کا اسی بات کی طرف اشارہ تھا۔ پرتاپ سنگھ  
 نے یہ حربہ اپنے اوپر لے کر اس کی وقعت کو کم کر دیا۔ اپنے آپ پر ہنسنا ایک  
 بہت بڑا فن ہے۔ پرتاپ سنگھ بولا۔  
 ”بلکہ ایک دن میں دو دفعہ بجا کریں گے۔ ایک دفعہ جب کہ بارہ بجا کرتے  
 تھے اور دوسری بار جب کہ ایک بجا کریں گے۔“

اب تک سب پرتاپ سنگھ اور رحمت نوز کی ان باتوں میں دلچسپی لینے  
 لگے تھے، اُن کو دیکھ کر ہیڈ کلرک کے نائب صاحب بھی تشریف لے آئے۔ آپ  
 ان معدودے چند آدمیوں میں سے تھے جو اندر سے شریف ہوں، لیکن یوں  
 بد معاش نظر آئیں۔ بڑی بڑی سیندھیا موچھیں، گھنے ابرو، ناک بھدی اور  
 چمکی ہوئی آپ نے آتے ہوئے اپنی اہمیت جتائی۔ ادھر ادھر دیکھ کر ضبط و  
 احتساب کا سماں پیدا کرتے ہوئے بولے۔ ”ہیڈ کلرک صاحب بہت  
 خفا ہو رہے ہیں۔ شور نہ مچائیے۔۔۔ اور پھر ان کے شور میں شریک ہو گئے  
 خود بھی طبیعت شاہانہ پالی کھتی بلکہ اکبرانہ، کیوں کہ اس دن باگھ اور ہوائی میں  
 لڑائی اٹھتی دیکھ کر آپ کے کئی جذبات کو آسوگی ہوئی تھی۔ ہیڈ کلرک صاحب تو  
 اپنی سیٹ سے ہلٹے ہی نہیں تھے۔ انہیں ہمیشہ مثال قائم کرنے کی پڑی رہتی تھی  
 تقلید کی عیاشی کا حظ نہیں اٹھایا تھا۔ نئے نئے ڈویژن سے بدل کر آئے تھے  
 نہایت شریف، ڈیلے پتلے، حسنا متبرکہ کے حامل۔ دفتر میں دو منٹ کی بھی

فرصت ہوتی تو آنکھیں بند کر کے اپنے اللہ کو یاد کرنے لگتے۔ مستنوی مولانا روم اور تذکرۃ الاولیاء سے تعلیم شروع ہو کر انہی دو کتابوں پر ختم ہو جاتی تھی خشوع و خضوع کے بڑے قائل تھے۔ ذرا جذبات کو کسی نے چھیڑا تو آنسو ہیں کہ بہے چلے جا رہے ہیں۔ خیر آپ وہیں بیٹھے تماشاً دیکھتے رہے۔ جب پرتاپ سنگھ نے رحمت نور کا حربہ اپنے اوپر لے لیا تو رحمت نور نے سنی آرڈروں کی رسیدیں اکٹھی کیں اور کانٹوں کو چھوتے ہوئے بولا:

”چوں کفر از کعبہ بر خیزد کجا ماند مسلمان“

پرتاپ سنگھ تلملایا۔ فارسی اس کے باپ دادا کو نہیں آتی تھی اور رحمت نور منشی آدمی آدمی بات پر گلستاں کے توالے دے۔ اس نے نہایت بے بسی کے عالم میں چاروں طرف دیکھا۔ گویا کہہ رہا ہے، یہ ظلم ہے، سراسر ظلم ہے۔ پنجابی بولے پنجابی میں جواب لے، ذرا میدان میں آئے۔ پرتاپ سنگھ ہر غیر ملکی زبان کو کھلا علم کہہ کر پکارا کرتا تھا۔ سٹپٹائے ہوئے بولا ”یہ کیا کالا علم ہے کھا جا صاحب؟ اور اب کے خواجہ صاحب کا نام بڑے ادب اور تپاک سے لیا گیا۔ رخ علاحدہ اور واؤ معدولہ۔ اور پرتاپ سنگھ بالکل اس طرح ادھر ادھر دیکھ رہا تھا جیسے کوئی ڈوبتا ہوا آدمی مدد کے لیے اپنی وحشت ناک اور پھٹی پھٹی نگاہیں ادھر ادھر چاروں طرف ڈالتا ہے۔ خواجہ اور نائب ہیڈ کلرک جسے ڈاکخانہ کی اصطلاح میں تحصیل دار کہتے تھے، بولے۔۔۔ رحمت نور کہہ رہا ہے۔۔۔“ اگر کفر کعبہ سے ہی پیدا ہونے لگے، تو مسلمان کدھر جائے گی۔۔۔؟

پرتاپ سنگھ نے بدلہ چکاتے ہوئے کہا ”تو مسلمان میرے پاس جلی آئے گی، ادھر واگوروا کا دیا بہت کچھ ہے۔۔۔ اس پر سب خاموش ہو گئے۔“

رحمت نور اور پرتاپ سنگھ، کرپا اور عنایت مسیح، یہ سب لوگ ہنستے کھیلتے  
چینتے چلاتے ایک سانس میں دعائے خیر اور دوسرے میں فحش گالی بکتے اپنا اپنا  
کام کیے جاتے۔ ان کا سینگ فرا، ان کا کورس ایک قومی ترانہ کی طرح پُر جوش  
اور جمود شکن ہوتا۔ ان کی گالی ہمیشہ مختصر ہوتی لیکن دعاؤں کے دفتروں سے  
زیادہ بلیغ اور پھر زود اثر۔۔۔!

ان چھٹی رسالوں میں سے کچھ شہر کے بنے والے تھے لیکن اکثر دیہات  
میں سے آئے تھے۔ سب کے سب سیدھے سادے تھے، اور بڑے احتیاط سے  
نا تراشیدہ بگراں کی تہذیب چیونٹی اور شہد کی مکھی سے بھی زیادہ پُرانی تھی جس  
فنی مہارت اور پرکاری سے یہ الفاظ کے گھر وندے بناتے، اس کے لیے اب  
زیادہ تراش تراش کی ضرورت بھی تو نہ رہی تھی۔ یہ بنا جانے بوجھے گالی کے  
لطیف فن سے واقف تھے اور صدیوں سے اس ادارے کی اہمیت سے آشنا  
اور اس بڑی سچائی تک پہنچنے کے لیے کہ گالی بعض دفعہ اپنے اظہار خیال کا  
مختصر اور جامع اور واحد طریقہ ہے، سوچنے کے لیے نہ کسی درمیانی عمل کی  
ضرورت تھی نہ تجزیہ اور حوازی کی۔

ڈاک خانہ کی بوت کے یہ دو سو بیل اسی طرح ہنس کھیل کر اپنے  
دبے ہوئے جذبات کو فحاشی سے آسودہ کر کے جب ایک ساتھ اور ایک سمت  
زور لگاتے تو ڈاک خانے کا یہ چھکڑا چلتا رہتا لیکن اس واقعہ کے دوسرے  
روز ان کی گاڑی کی رفتار ناہموار ہو گئی

دوسرے دن پھر رحمت نور قدرے دیر سے برا بیچ میں داخل ہوا لیکن  
پرتاپ سنگھ کو دیکھ کر اس کی پیشانی کے تمام شکن استوار ہو گئے۔ پرتاپ سنگھ  
نے بھی رحمت نور کی طرف دیکھا اور مسکرایا۔ رحمت نور نے قبض کا تکرار ڈھیلا

کیا اور قمیص کو پنکھا بنا کر ہلاتے ہوئے کہا "آف! کتنی گرمی ہے! —  
الاماں! — الحفیظ! لیکن آج پرتاپ سنگھ کی حالت غیر تھی۔ یوں معلوم ہوتا  
تھا جیسے اسے لو، لگ گئی ہے۔ رحمت نوری نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"آج خالصہ جی کی بکری بیٹھی ہوئی ہے۔"

پرتاپ سنگھ خاموش رہا۔ رحمت نوری بولا۔ ابے جھکڑ سنگھ!

پرتاپ سنگھ نے پھر رحمت نوری کی طرف دیکھا۔ مسکرایا اور بولا "خالصہ جی

کی بکری نہیں بکرا ہوتا ہے۔ اور پھر وہ بکرے کی طرح میا یا۔

سب ہنس دیے۔ گویا لوگوں کی دیوالی ہوتی ہے سردار جی کا دیوالہ۔

خواجہ نے دخل اندازی کرتے ہوئے کہا "جو اب مسکت دیا ہے پرتاپ سنگھ نے

مان لیا ہم نے اسے۔ آج حالت غیر ہے لیکن پھر بھی — ہاتھی بیٹا ایک لاکھ

کا اور سراسوا لاکھ کا۔"

پرتاپ سنگھ نے فخر سے ڈاڑھی پر ہاتھ پھیرا۔ خواجہ نے گھڑی کی طرف

دیکھا اور پھر رحمت نوری کو جھڑکتے ہوئے بولا "رحمت نوری! کھئی واپسی جلدی دو

دیکھو سردار سب بچھ لوٹنا چکا ہے۔"

"جھک مارتا ہے سردار۔" رحمت نوری نے کہا۔

خواجہ نے اپنے آپ سردار کی صفائی پیش کرتے ہوئے کہا "بہتر منی آڈرول

میں سے صرف تین واپس لایا ہے۔ — صرف تین!

پرتاپ سنگھ نے فاتحانہ انداز سے رحمت نوری کی طرف دیکھا اور کہا "رحمت

نوری اور کام!... اب بے چاری رنڈیوں کو بھی کاٹنا پڑ گیا ہے۔"

رحمت نوری نے خواجہ کی طرف دیکھا، خواجہ مسکرا دیا اور رنڈو کنایہ میں

گویا اجازت دے دی۔ رحمت نوری نے اس سرکاری تائید سے فائدہ اٹھاتے



ہوئے اپنے تھیلے کو میز سے سرکا دیا۔ دائیں ہاتھ کی شہادت کی انگلی اور انگوٹے اور بائیں ہاتھ سے میز پر طبلے کی تھاپ دیتے ہوئے گانے لگا۔

بھائی جی دی کچھ وچ گوہ ڈر گئی

اک کڈھن لگے دو جی ہور ڈر گئی

سردار جی کے کچھے (سکھوں کی ایک شرعی پوشش) میں گوہ داخل

ہو گئی ہے۔ ایک گوہ کو نکالنے لگتے ہیں تو دوسری داخل ہو جاتی ہے)

سب کے سب اس زٹل قافیہ پر بیٹنے لگے۔ جنگ کی وجہ سے قیمتوں کی مہنگائی اور مشاہرے کی کمی سماجی دباؤ کی وجہ سے جذبات کا ضبط، سب کچھ ان ہی کلرکوں اور چھٹی رسالوں کے چہرے پر لکیروں کی صورت میں لکھا اور ہوائیوں کی صورت میں چھایا ہوا تھا لیکن افسوس فحاشی اور دشنام طرازی کی وجہ سے انہیں یہ بوجھ محسوس نہیں ہوتا تھا اور وہ ہنسی خوشی اپنا کام کیے جاتے بلکہ کام باقاعدگی اور تیزی سے ہوتا تھا۔ اس علیک سلیک کے بعد رحمت نوز پر تاپ سنگھ، ان کے ساتھی اور کلرک سب آسودہ خاطر ہو گئے۔ سارے دن کی مشقت کے بعد گویا تازہ دم ہو گئے۔

رحمت نوز کا علاقہ \_\_\_\_\_ حلقہ جسے دفتری زبان میں ٹریسٹہ الف کے

نام سے موسوم کیا جاتا تھا، بہت گندہ علاقہ تھا۔ یہ شہر کی نئی آبادی تھی۔ آج اگر سفید زمین ہوتی تو کل وہاں ایک خاصا محل کھڑا ہوتا \_\_\_\_\_ کہاں کی

اینٹ، کہاں کاروڑا، بھان متی نے کنبہ بوڑا \_\_\_\_\_ کوئی ملتان میں "روٹی سیکورڈ"

کہتا تو کوئی "کڈھائی و بجنی" کوئی پوٹھو ہار کی تہذیب کا باشندہ ہوتا تو کوئی۔

کشمیری لگے زئی اپنی اپنی ڈفلی اپنا اپنا راگ، نتیجہ موسیقی نہیں، ایک بے ہنگم سا شور، نیم بورڈوا سے لوگ جو محض اس بات پر خوش رہتے، کہ انہیں کسی کی پرولہ

نہیں ہے، جو کسی کے مکان سے واقف ہوئے بھی اس کا پتا بتانے میں اپنی سبکی سمجھتے۔ ایسے علاقے میں ڈاک تقسیم کرنا رحمت نوری کا کام تھا اور پرتاپ سنگھ کا علاقہ اس سے بھی بُرا تھا۔ صاف تھا ستھرا تھا لیکن ریلوے کا لونی کے ہر باشندے نے ایک کتار رکھا ہوا تھا جو ہر روز بلاناغہ پرتاپ سنگھ کی گردن دیوچنا۔ دونوں نے اس کا عمل نکالا ہوا تھا۔ رحمت نوری نے علاقے کی عورتوں میں ہر دل عزیز می حاصل کر لی تھی اور پرتاپ سنگھ کتوں سے بچنے کے لیے ایک آنہ روز کے چھپڑے خرید لیتا اور جب کوئی کتا کاٹنے آتا تو پچکار کر چھپڑوں کی رشوت دے دیتا۔ اس کے باوجود گرمیوں کی چلچلائی دھوپ میں ان کی جان نکل جاتی۔ کہیں بخشش مل جاتی تو ایک ادھ گلاس سنبھین کا پیا جاتا۔ نہیں تو ٹھنڈا پانی اور گھر کی راتی —

دھوپ کی شدت سے آج پرتاپ سنگھ بہت گھبرایا ہوا تھا اس کی مسلسل خاموشی کے باوجود رحمت نوری نے اسے دبوچے رکھا اور پوچھنے لگا "آج دیر سے کیوں آئے ہو پرتاپ سنگھ؟"

تمہاری ماں کے ساتھ سو رہا تھا۔ پرتاپ سنگھ نے ایک غصیلے کتے کی طرح باچھیں اوپر اٹھاتے ہوئے کہا۔ رحمت نوری ناراض نہیں خوش ہوا کہ وہ پرتاپ سنگھ کو پھڑانے میں کامیاب ہو گیا۔ اچانک بائیں طرف سے ایک بادل کی گرج سنائی دی۔ یہ بادل نہیں تھا۔ رشید الدین ہیڈ کلرک صاحب تھے۔ لبوں کے کنارے کف کی ایک کافوری تحریر سی دکھائی دے رہی تھی۔ آنکھوں سے ڈبل کنکھیوں کے پچھے سے چندھی سی آنکھیں یوں دکھائی دے رہی تھیں جیسے دو چھوٹے چھوٹے پائیوں میں سے چنگاریاں نکل رہی ہوں۔ بولے "یہ دفتر ہے یا فحاشی کا اڈہ؟ میں یہاں کسی کو گالیاں

نہیں بکنے دوں گا؟

”بات یہ ہے جناب“ پرتاپ سنگھ نے جواب دعوے کے انداز میں کہا۔ میں

..... میں.....“

”میں میں کا بچہ۔۔۔ خیر دار جو آئندہ ایسا ویسا لفظ نکالا تو...“

”میری بات...“

”میں کوئی بات وات سننا نہیں چاہتا۔ سمجھے۔۔۔ میں پوسٹ ماسٹر کے

سامنے اس امر کی شکایت کروں گا۔“

سب خاموش ہو گئے۔ پرتاپ پوسٹ ماسٹر صاحب کے حضور میں پیش کی

گئی۔ پرتاپ سنگھ اور رحمت نور پر چارج شیٹ لگا۔ لیکن معاملہ تنبیہ سے آگے نہ

بڑھا۔ بڑی خیر ہوئی ایک باقاعدہ آفس آرڈر نکالا گیا جس میں اخلاقیات کے

متعلق ایک فحش ابتدائیہ تھا اور اس کے بعد ایک غیر مرکب حکم تھا جو کوئی چھٹی

رساں مینی آرڈروں، چٹھیوں، بیرنگوں، پارسلوں، رجسٹر یوں کی واپسی دیتے

ہوئے فحش کلامی کرے گا، اسے فوراً معطل کر دیا جائے گا۔ اور ایمر جنسی پر قابو

پانے کے لیے ہیڈ کلرک کے اختیارات بھی وسیع کر دیے گئے۔

اب دفتر ایک اچھا خاصا قبرستان بن گیا تھا۔ کان مقابل کی خاموشی کو

پاکر سارا دن سائیں سائیں کرتے رہتے اور ہیڈ کلرک رشید الدین آنکھیں بند

کر کے روحانی منازل طے کرتا اور اپنے نفس کی بانگ در اسٹن کر حفظ اٹھاتا۔ اس

کا روح کا جو وقار تکلم سے ضائع ہوتا تھا، اب محفوظ تھا۔

رحمت نور ایک روز معمول سے زیادہ دیر میں آیا۔ اس کے چہرے کی لکیریں

زیادہ گہری تھیں۔ آتے ہی اس نے اپنی پھیلی نیچے رکھ دی اور پنگ پانگ والی

میز کے کنارے بیٹھ گیا اور واپسی کے کاغذات اور چیزیں کھیر لیں۔۔۔

رحمت نور نے دونوں ہاتھ باندھ دیے اور منت کے لہجہ میں بولا:

”خواجہ جی۔ النذر سول کے لیے مجھے ٹریسٹر الف سے نکالے۔ میں مر جاؤں گا۔  
خواجہ نے روکھے پھیکے انداز میں کہا ”یہ تم لوگوں کا بہانہ ہے۔ میں تمہاری  
شکایت کروں گا۔ کیا اس سے پہلے تم نے اس حلقے میں کام نہیں کیا۔“

”خواجہ جی! رحمت نے اسی طرح منت سے کہا: اب اس رقبہ میں آبادی  
دو گنی ہو گئی ہے، شاید یہ آپ نہیں جانتے اور اگر میرے کہنے پر آپ کو یقین نہیں  
ہے تو ٹاؤن انپیکٹر صاحب کو کہیے کہ وہ چل کر دیکھ لیں۔“

اور پھر راز دارانہ لہجے میں بولا۔

”آپ جانتے ہیں اور سیر بھی اپنے دفتر کے کین کرنے کے لیے مجھے دے  
دیتا ہے اور خالد صاحب ٹاؤن انپیکٹر صاحب بھی۔“

اور پھر رحمت نور سفید خاکی دیوار کی طرف دیکھنے لگا جہاں ایک کیلنڈر  
کے سوا کچھ نہ تھا لیکن رحمت نور کو اس دیوار پر جانے کیا کچھ دکھائی دے رہا  
تھا۔ وہ کچھ دیر چُپ رہا پھر بولا۔

”خواجہ صاحب میری سفارش کیجیے۔ میرے چھوٹے چھوٹے بال بچے ہیں۔“

اور رحمت نور منی آرڈروں کی رسیدیں پکڑ کر پھر دیوار کی طرف دیکھنے لگا  
پر تاپ سنگھ آیا۔ اس کے ہاتھ پر ہٹی بندھی ہوئی تھی اور آتے ہی رحمت نور سے  
کچھ دور ہٹ کر بولا۔

”چودھری صاحب سلام“

چودھری صاحب نے لمبا سامنہ بناتے ہوئے کہا۔

”وعلیکم السلام۔ کہیے مزاج تو اچھے ہیں؟“

رحمت نور اور پرتاپ سنگھ اس رسمی گفتگو سے اتنے مایوس نہیں ہوئے

جتنے خواجہ صاحب۔ وہ ہکا بکا ان دونوں کی طرف دیکھ رہے تھے۔ ایک لڑکے  
لئے انھوں نے پن ہولڈر اپنے دانتوں میں دبایا۔ اور پرتاپ سنگھ کی طرف دیکھے  
بغیر بولے :

”پرتاپ سنگھ واپسی دے دو“

پرتاپ سنگھ نے خواجہ صاحب کی طرف نہ دیکھا اور جلدی جلدی اپنے  
تھیلے میں سے منی آرڈر نکالنے لگا۔ ہیڈ کلرک صاحب نہ جانے کیوں مراقبے سے  
اٹھ کھڑے ہوئے اور دونوں ہاتھ بغل میں دے کر کمرے کے ادھر ادھر ٹہلنے  
لگے اور سنہ میں بڑبڑانے لگے۔

”آج بہت دیر ہو گئی ہے۔۔۔ بہت دیر۔۔۔“

خواجہ صاحب نے تائید کرتے ہوئے کہا: ”جی ہاں۔۔۔ ہیڈ کلرک  
صاحب۔۔۔ پتا نہیں کیا بات ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے جیسے دن چھوٹے  
ہو گئے ہیں۔“

پرتاپ سنگھ نے منی آرڈر میز پر بکھیر دیے۔ خواجہ صاحب نے ایک نظر  
منی آرڈروں کی طرف دیکھا اور پھر قلم کو سنہ میں رکھ لیا۔۔۔ رشید الدین حنا  
نے رسیدوں کی طرف دیکھا اور بولے: ”پرتاپ سنگھ اتنی واپسی کیوں  
لائے ہو؟“

پرتاپ سنگھ نے ہکلاتے ہوئے کہا: ”سرکار، یا بندے دوہری تہری کوشش  
کے باوجود نہیں ملتے۔ نہ جانے لوگ کدھر چلے گئے ہیں؟“

ہیڈ کلرک نے شیرازی کبوتر کی طرح گردن پھلاتے ہوئے کہا۔

”ہوں۔۔۔“

رشید الدین اپنی میز کی طرف جا رہے تھے لیکن نہ جانے انھیں کیا خیال

آیا۔ یکھنت پلٹ پڑے اور خواجہ صاحب سے خطاب کرتے ہوئے بولے: خواجہ  
یار! ان کی کوتاہیوں کو ایرتک میں نوٹ کر دینا: خواجہ اپنی کرسی سے اٹھا  
اور میاں صاحب تک پہنچتے ہوئے بولا: میاں جی جھار چپٹ سے  
کام چل جاتا ہے تو کیا ضرورت ہے دفتری کارروائی کی؟ ریکارڈ خراب  
ہو جائے گا بے چاروں کا!  
ہیڈ کلرک نے کڑی نگاہوں سے خواجہ کو دیکھتے ہوئے کہا: یہ سب شرارت

ہور ہی ہے۔

خواجہ نے کہا: یہ بات غلط ہے میاں جی!

خواجہ چلا آیا۔ میاں جی چلے گئے لیکن رحمت نوز اور پرتاپ سنگھ بیٹھے  
تھے اور کھوکھلی سی نگاہوں سے ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ رحمت نوز کی  
پگڑی پھر کچھ ڈھیلی ہو رہی تھی۔ بالوں کی ایک لٹ باہر نکل آئی تھی۔ پرتاپ سنگھ  
نے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا: "یار دیکھ تیرے بال باہر نکل آئے ہیں۔ انھیں ڈھانپ  
لے۔ پوسٹ ماسٹر دیکھ لے گا۔"

رحمت نوز نے چپکے سے بال پگڑی کے اندر ڈھانپ لیے اور بیزاری سے

بولا: نکلنے دو یار۔۔۔ منتر لگے عاشقاں چہ دوزخ چہ بہشت۔"

پرتاپ سنگھ نے ایک لمحہ کے لیے رحمت نوز کی طرف دیکھا اور بولا: یار  
تجھے اتنی فارسی آتی ہے تو تو کھانے میں محزر کیوں نہ ہوا۔ سنٹی گیری کے علاوہ  
اوپر سے کچھ نہ کچھ ہو ہی جاتا ہے۔ پھر کسی کو ٹھڈے مارو گا لی دو، کوئی پوچھتا  
ہی نہیں!

رحمت نوز نے تھوڑی دیر کے لیے اپنے آپ کو شہید شمار کیا اور ایک  
روکھا پھیکا سا تبسم لبوں پر لا کر بولا: یہاں کبھی۔۔۔ ڈاک خانہ میں

اگر یوں ہی مٹی خراب کرنا تھی ۛ

بہت سے چھٹی رساں ابھی اپنے معلقوں سے واپس نہ آئے تھے بابو لوگ  
سنا اٹھا اٹھا کر گھڑیوں کی طرف دیکھ رہے تھے۔ سنی آرڈر کے محکمہ میں کرپا اور  
خیراتی داخل ہوئے۔ پھر عنایت شیخ آیا لیکن ہیڈ کلرک صاحب نے کچھ نہ کہا۔  
ایک دیر سے واپس آتا ہوا تو کسی کو کوئی کہے بھی۔ پھر واپسی بھی زیادہ آنے لگی نصف  
سے کم ہی چیزیں تقسیم ہوئیں۔ زیادہ واپس کر دی جاتیں۔ چھٹی رساں بابو سب  
لوگ مایوس تھے۔

سارے ہفتہ بھر کی ڈیلیوری برابریوں پر واپس پڑی رہی۔ رشید الدین  
صاحب آنکھیں جھپکنے ہوئے ادھر ادھر دیکھتے رہے۔ چھٹی رسالوں کو آنا فانا  
محسوس ہونے لگا کہ مہنگائی الاؤنس کم مل رہا ہے۔ ہفتہ کے دن پوسٹ  
ہین یونین کی معرفت شور مچا دیا گیا۔

پیر کے دن چھٹی رساں کا آدھا سیٹ اوزار کی چھٹی مناکر اور تازہ دم  
ہو کر آیا۔ اسی نصف سیٹ میں رحمت نورا اور پرتاپ سنگھ بھی شامل تھے پرتاپ  
سنگھ نے رحمت نورا کی طرف دیکھا اور رحمت نورا نے پرتاپ سنگھ کی طرف پرتاپ  
سنگھ اپنی جالی کو اٹھا رہا تھا اور رحمت نورا کے پنکھے کا سوچ گھا رہا تھا۔  
دو لوں ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر مسکرائے۔ پرتاپ سنگھ نے اپنے گرد  
و پیش کو بھولتے ہوئے کہا ”سنا بے سورا کے جنے؟“

”اے جاناں کے...“

رشید الدین ایک سٹون کے پیچھے کھڑے تھے۔ انھوں نے رحمت اور پرتاپ  
سنگھ کی علیک سلیک سنی۔ ڈبل کان کیو کے پیچھے سے ایک دفعہ انھوں نے رحمت  
اور پرتاپ کو دیکھا اور خدا کا شکر ادا کرتے ہوئے خاموش ہو گئے۔



(۱) محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

کتابی کتابوں میں لکھی ہوئی ہیں۔

نہیں، اس لیے اس کتاب میں لکھی ہوئی ہیں۔

## ایک عورت

ماؤن ہال کے سامنے نسیم باغ کے اندر دو تین چیزیں ہی میری توجہ کا مرکز تھیں۔ ایک لمبا سا مستطیل کا درخت جو بھیگی ہوئی سبز جمال کا ایک تو بصورت کوٹ پہنے تھا اور جو ہوا میں دور دیہڑھ رام دھن کے قدرتی نشیب سے ایک سڑابی کی طرح جھومتا نظر آتا تھا۔ دوسرے گلندڑا احمق سا طالب علم، جو اپنی کتابوں کو دور پھینک کر ہمیشہ ایک ہی انگریزی گانا گایا کرتا تھا، جس کا مطلب ہے۔۔۔ جب سردی آتی ہے تو بہار دور نہیں رہتی۔ ان دونوں کے علاوہ بیس بائیس برس کی ایک عورت دکھائی دیا کرتی جو اپنے تقوٰۃ زدہ بچہ کے رال سے آلودہ چہرے کو چومتے ہوئے دیوانی ہو جاتی۔ وہ عموماً ایک ہی طرح کی سفید ویل کی سادہ ساڑھی پہنا کرتی۔ اور اس کے تیوروں کے درمیان کہیں لکھا ہوتا۔۔۔ پرے ہٹ جاؤ پہلے پہل جب میں نے اسے دیکھا تو مجھے خیال پیدا ہوا کہ وہ بھوکے ہے لیکن اس کے فوراً بعد ہی اس نے کچھ مائٹے خریدے اور اپنے بچے کے سامنے بکھیر دیے۔ اگر وہ بھوکے ہوتی تو ضرور ان مائٹوں میں سے ایک ادھر مائلٹا کھا کر اپنے پیٹ کی آگ بجھا لیتی۔ پھر میں نے سوچا کہ شاید وہ جلسی بھوک

## کو کھ جلی

کی شکار ہے لیکن اگر میرا یہ خیال درست ہوتا تو اس کے ماتھے پر وہ تیور نہ ہونے اور وہ توڑے فی صدی ٹورٹوں کی طرح اپنے لیے بھی کوئی شوخ رنگ منتخب کرتی۔

لقوہ زدہ ہونے کے باعث اس کا بچہ بد صورت تھا اور اس کا چہرہ ہمیشہ رال سے آلودہ ہوتا تھا۔ اس کی ماں بیسیوں دفعہ رو مال سے اس کا منہ اور ٹھوڑی صاف کرتی، لیکن بچہ ایک احتجاج سے ادھر ادھر سر بلانے لگتا اور صاف کیے جانے کے فوراً بعد ہی لعاب کے پیلے اڑانے لگتا، جو ہوا سے بھرتے ہوئے اس کی ماں اور اس کے اپنے چہرے پر آگرتے اور ایک عجیب نفرت انگیز کیفیت پیدا ہو جاتی۔ اس کے بعد وہ ایک بے معنی احمقانہ ہنسی مینے لگتا اور وہ عورت خوشی سے رونے لگتی۔

بعد میں مجھے پتا چلا کہ ایک سیاہ موٹر جو ہر روز نسیم باغ کے دروازے پر آکھڑا ہوتا ہے اور جس کا ڈرائیور بڑی بد تمیزی سے ہارن کو زور زور سے بجاتا ہے، اسی عورت کو لینے آتا ہے۔ اس کا رہیں سے ایک لمبا چوڑا مرد ایک چوڑی دار پا جامہ جس کا ازار بند لمل کی قمیص کے پتے سے جھانکا کرتا، پہنے آتا۔ اس کی گرگابی کا پینٹ چمڑا بہت چمکتا تھا۔ اس کا منہ پان کی پیک سے بھرا ہوا ہوتا۔ زیادہ قریب ہونے سے اس کی سرخ آنکھوں اور اس کے سانس کے تعفن سے اس کے شرابی ہونے کا پتا چلتا۔ شاید وہی آدمی اس بچے کے لقوہ زدہ ہونے کا باعث تھا۔ وہ اس عورت کے قریب آکر اُسے بہت گرسنہ لگا ہوں سے دیکھا کرتا اور اسے بازو سے پکڑ کر موٹر کی طرف لے جانے کی کوشش کرتا۔ ان حرکتوں سے وہ اس عورت کا خاوند تو دکھائی دیتا تھا مگر اس بچے کا باپ نہیں۔

اپنے خاوند کے بلائے پر بھی وہ عورت اپنے مخصوص دیوانے پن سے اس بچے کے ساتھ کھیلتی جاتی اور اس کا خاوند بسا اوقات ایک ٹھنڈے پر بیٹھ کر ٹانگیں پھیلائے اپنی بیوی کی مجنونانہ حرکتوں کو دیکھتا، کچھ عرصہ بعد بیوی ان ہی دور باش نگاہوں سے اپنے خاوند کی طرف دیکھتی اور بچے کے چھوٹے موٹے کپڑے، مالے، سیلولائیڈ کے کھلونے سمیٹنے لگتی۔ ادھر بارن کی آواز بلند ہوتی جاتی۔ ادھر عورت اپنے کام میں تیزی سے منہمک ہو جاتی۔

مجھے اس عورت سے ایک قسم کا انس ہو گیا تھا۔ ایک قسم کی دلچسپی جس کی بنا پر میں اس کی ہر حرکت میں معافی تلاش کر لیتا تھا۔ میں نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ عورت واقعی خوب صورت تھی یا نہیں، لیکن میرے تخیل نے اسے بے حد حسین بنا لیا تھا۔ اس کا بالوں کو سوار نے کا اندازا مجھے بہت پسند تھا وہ جھٹکے سے اپنے بے ترتیب بالوں کو پیچھے کی طرف پھینک دیتی اور اپنی انگلیاں پھیلا کر شانہ کی طرح ان میں داخل کرتی ہوتی اپنا ہاتھ پیچھے کی طرف لے جاتی اور میرے لیے یہ تمیز کرنا مشکل تھا کہ اس کی حرکتیں ارادی ہیں یا غیر ارادی۔ مجھے اس کے خاوند کی طرح اس کے بچے اور اس کے لعاب آلود چہرے سے بے حد نفرت تھی۔ البتہ بچے کی بے چارگی پر رحم بہت آتا جو میرے دل میں محبت کے جذبہ کو اکسا دیتا لیکن اس قسم کی محبت جس کی تہہ میں ہزاروں انٹریں کوٹ کوٹ کر بھری ہوں، اس سے تو محبت نہ کرنا ہی اچھا ہے۔

بہت دنوں تک میں کسی ایسے موقع کا منتظر رہا جب میں اس عورت سے ہم کلام ہو سکوں، جیسا بازار کی محبت میں ہوتا ہے کہ کسی لڑکی کی کوئی چیز گر جاتی ہے اور کوئی لڑکا اُسے اٹھا کر صاف کرتے ہوئے کہتا ہے:

”محترمہ — آپ کا رونا مال؟“

پھر وہ لڑکی مسکرا کر شکریہ ادا کرتی ہے اور بس محبت شروع ہو جاتی ہے۔  
میں بہت دنوں تک دیکھتا رہا کہ اس عورت کی کوئی چیز گرے اور میں کہوں۔  
محترمہ — آپ کی... آپ کی... آپ کی...!

اور پھر محبت شروع ہو جائے۔ مگر وہ عورت بہت محتاط تھی اور اس نے مجھے  
کوئی ایسا موقع نہ دیا۔ اکثر وہ مجھے ارد گرد منڈلاتے ہوئے دیکھتی، لیکن میں  
اس کو متوجہ نہ کر سکا۔

آخر اسے ایک دن مالٹے خریدنے کی ضرورت پیش آگئی۔ اس  
وقت بچے کی جرابیں، ربڑ کی گڑیاں اور کھانے کی چند چیزیں جن کے آس  
پاس کوٹے منڈلا رہے تھے، پڑی تھیں۔ اگر وہ بچے اور ان چیزوں کو  
چھوڑ کر جاتی تو یقیناً کوٹے ان چیزوں کو کھا جاتے اور شاید بچے کی چمکتی ہوئی  
آنکھوں کو ٹھونگ بھی لیتے۔ بچے میں پہچاننے کی صلاحیت پیدا ہو رہی تھی اور  
وہ مالٹوں کا سرخ رنگ پسند کرتا تھا۔ اس عورت نے کئی مرتبہ اٹھانا چاہا  
لیکن سب باتوں کی وجہ سے وہ اٹھ نہ سکی۔ میں نے موقع پا کر اسے کچھ  
کہنا چاہا لیکن چند دنوں سے اسے مخاطب کرنے کے لیے جو الفاظ میں نے  
حفظ کر رکھے تھے، بھول گئے اور میں فقط یہی کہہ سکا۔

محترمہ!... آپ کیا چاہتی ہیں —؟

اور اس عورت کے تیور بدستور قائم رہے، میں جو اسے اپنے خاوند  
کی آنکھوں میں دکھائی دیتا تھا، اس نے پھر اسی نفرت سے بھری ہوئی  
آواز میں کہا —

”جی نہیں، مجھے آپ کی مدد کی ضرورت نہیں!“

— اور میری محبت مقفل پڑی رہی۔

اس عورت کا خاوند مویشیوں کے اسپتال میں معلم تھا۔ کم از کم اس کی شکل اور باتوں سے تو یہی پتا چلتا تھا۔ ہر وقت حیوانوں کے ساتھ رہنے سے اس میں ایک خاص قسم کی حیوانیت پیدا ہو چکی تھی۔ اسے اپنے لقوہ زدہ بچے پر کبھی پیار نہیں آتا تھا اور جب اس کی بیوی بچے کو اس کے بازوؤں میں دھکیلنے کی کوشش کرتی تو وہ گھبراتا ہوا پیچھے ہٹ جاتا۔۔۔۔۔ ہے ہے! میرے کپڑے خراب ہو جائیں گے۔۔۔ میرے، میرے۔۔۔۔۔“

اور پھر وہ ان ہی گرسنہ نگاہوں سے اپنی بیوی کی طرف دیکھتا ہوا کہتا۔  
”چلو میری جان۔ شو فراب بہت شور مچا رہا ہے۔“

اس عورت کا نام دتو تھا۔ خاوند اور بیوی کی باہم گفتگو سے مجھے اس کے نام کا پتا چل گیا تھا۔ دتو کتنا خوبصورت نام ہے۔ آہستہ سے پکارا جائے تو کتنا اچھا لگتا ہے اور جب دتو ناراض ہو جائے تو یہ نام لے کر اسے پککارنے میں کتنا لطف ہے۔۔۔۔۔ یا شاید یہ سب کچھ مجھے ہی محسوس ہوتا تھا۔

ایک دن اس کا خاوند کہہ رہا تھا۔

”ہمارے اسپتال میں یہی ہوتا ہے۔“

”تو ہوا کرے؟ دتو نفرت سے بولی۔“ وہ کوئی انسان گھوڑے ہی

ہیں۔

”وہ بہتر انسان ہیں۔“ خاوند نتھنہ پھلاتے ہوئے بولا۔

”کیا تمہارا خیال ہے کہ ایک گھوڑے کو لہڑا ہوا جانے پر مارنا نہیں چاہیے کیا یہ اچھا ہے کہ اس کا مالک اس سے برابر کام لیتا ہوا اسے ہر روز چابکوں سے زخمی کرتا رہے؟“

دیتو نے بدستور نفرت سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا: "تو کیا  
اُسے کھلا نہیں چھوڑ سکتے؟"

دیتو کا خاوند اپنے بیٹے کی طرح احمقانہ ہنسی ہنسنے لگا اور بولا:  
"اس طرح کوئی اسے کھانے کے لیے کچھ نہ دے گا اور وہ بھوکوں مر جائے  
گا۔ اب یہ فیصلہ تمہارے ہاتھ رہا کہ اس کے ایک دفعہ گوئی مار کر اذیت دینا بھلا  
ہے یا اس کا روز روز کا مرنا؟"

دیتو لا جواب ہو گئی۔ اس نے لعاب سے بھرے ہوئے اپنے بچے کی طرف  
دیکھا اور پھر اسے ایک گہرے مادرانہ جذبہ سے اپنی چھاتی کے ساتھ بچھینچ لیا  
اور بچہ خوش کرتا ہوا غلامی میں ہاتھ پاؤں ہلانے لگا۔ دیتو نے اسے اتنا پیار  
کیا کہ اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ میں ان سب باتوں سے ڈاکٹر کے  
خوفناک ارادوں سے مطلع ہو چکا تھا۔ ایک ڈاکٹر کے لیے یہ بات کون سی  
مشکل ہے۔ وہ دو تین دن تک سب کو کہتا پھرے گا۔ بچہ بیمار ہے۔  
اور پھر ایک دن چپکے سے اسے سلا دے گا۔ اس وقت بچہ گھناؤنے  
انداز میں خوش کرنے لگے گا اور اپنے ہاتھ پاؤں موت و حیات کی کش مکش میں ادھر  
ادھر بلائے گا۔ اس کی ماں جہاں کہیں بھی بیٹھی ہوگی اسے اپنے بچے کی  
مکلیف کا احساس ہو جائے گا۔ وہ یقیناً اپنے وحشی ہوس راں شرابی خاوند کے  
اس جرم کو براشت نہ کر سکے گی۔

انگلے دن میں بینک سے واپسی پر حسب معمول سنبیل کے سائے میں پہنچ  
گیا۔ وہاں وہی طالب علم اپنے مخصوص کھنڈرے انداز میں دو گیندوں کو بیک  
وقت اچھال کر پکڑنے کی کوشش کر رہا تھا اور اس کی کتابیں ہمیشہ کی طرح

بند، قریب کے درخت کے سائے میں پڑی تھیں۔ دمو اپنے بچے کو لیے موجود تھی اور اپنے بچے کے اس کے پیار کی ہر لپٹ سے ظاہر ہوتا تھا کہ گذشتہ دن کی تمام باتیں اس کے ذہن میں محفوظ ہیں اور وہ محبت کی ہر کروٹ کے ساتھ اپنے بچے کو زندہ کر رہی ہے۔ اس وقت وہ بچہ ریگتا ہوا گاڑی سے کچھ دور سنبل کے نیچے آگیا تھا اور سنبل کے پھیکے بے مزا پھل کو دانٹوں سے بچھول رہا تھا اور اس کی ماں اسے زندگی میں پہلی دفعہ چند قدم ریگتے ہوئے دیکھ کر خوش ہو رہی تھی۔ میں اس وقت صنوبر کے سائے سے نکلا اور مارکیٹ سے چند قیمتی سُرُخ مالٹے خرید کر نسیم باغ کو لوٹ آیا۔ وہ بچہ ابھی تک سُرُخ پھل کو بچھول رہا تھا میں نے مالٹے اس کی طرف بڑھا دیے اور بچہ ریگتا ہوا میری طرف آنے لگا آخر اس نے ایک مالٹا ہاتھ میں تھا م لیا اور میرے ہاتھ سے دوسرا مالٹا لینے کے لیے میری طرف بڑھنے لگا۔ دمو میری طرف متوجہ ہوئی۔ مجھے اس کے چہرے سے اس کے جذبات کا پتا چل رہا تھا۔ وہ سوچتی تھی، شاید اس کا بچہ جسے کل ہی اس کا وحشی شوہر محض اس بنا پر مار ڈالنا چاہتا تھا کہ وہ ان کی محبت کے راستے میں ٹھہرا تھا، کسی آسمانی برکت کے نزول سے چلنے لگے۔ اس کے چہرے پر امید و بیم کے تاثرات دکھائی دینے لگے۔ اگلے دن میں نے بازار سے چند ایک رنگ دار غبارے خریدے اور انہیں دھاگے سے باندھ کر بچے کے پاس رکھ دیا اور جب وہ نزدیک آکر انہیں پکڑنے کی کوشش کرنے لگا تو میں نے دھاگا کھینچنا شروع کر دیا اور غبارے میری طرف سرکنا شروع ہو گئے اور بچہ آہستہ آہستہ ریگتا ریگتا ان غباروں کی طرف بڑھنے لگا۔

دمو نے قریب آتے ہوئے کہا: ”دھاگا کو ذرا آہستہ آہستہ کھینچے“



## کوکھ جلی

میں نے دھاگے کو آہستہ کھینچتے ہوئے کہا — ”نہیں تو... اسے ذرا تیز چلنے کی مشق کرنی چاہیے“

اس کے بعد وہ خاموش ہو گئی اور اپنی پُرانی جگہ جہاں کہ وہ ہر روز بیٹھا کرتی تھی، واپس چلی گئی۔ پھر آئی اور پھر چلی گئی۔ لیکن یوں معلوم ہوتا تھا جیسے وہ وہاں بیٹھ نہیں سکتی۔ کچھ دیر بعد بچے کا لعاب آلودہ قراک بدلتے کی غرض سے وہ پھر چلی آئی اور میں نے کہا

”محترمہ! — کون جانے اس کا لقوہ بھی اچھا ہو جائے؟  
دھوکا چہرہ چمک اُٹھا۔

کئی روز ایسا ہی ہوتا رہا۔ میں ہر روز بینک سے لوٹتے ہوئے اس بچے کے لیے کچھ نہ کچھ لے جاتا۔ آخر ایک دن میں نے بہت دیر تک بچہ کو گود میں اٹھائے رکھا۔ میں نے اپنی جیب سے رومال نکالا اور اس کا لعاب سے بھرا ہوا منہ پونچھا۔ اس کے بعد میں نے بچہ کا منہ چوم لیا۔  
دھوکا چہرہ حیا سے سرخ ہو گیا۔ تھوڑے سے گونگو کے بعد وہ میرے قریب آگئی اور مسکرانے لگی۔

اس وقت سنبل کا درخت تیز ہوا کی وجہ سے زور زور سے ہل رہا تھا اور وہ کھلڈرا طالب علم سرد ہوا کے جھونکوں سے متاثر ہو کر وہی گیت گنگنانے لگا۔  
”جب سردی آتی ہے تو بہار دور نہیں رہ جاتی۔“

اس وقت لقوہ زدہ بچہ میری گود سے اتر کر ہمارے پاؤں میں رہنے لگا اور ہم دونوں جانتے تھے کہ اس کا لقوہ ٹھیک نہیں ہو سکتا۔





یہ سمجھ لیجیے کہ تیسرا دن بھی آپ کے ذمہ پڑا...!

”اچھا اچھا! سعادت نے خاموش ہوتے ہوئے کہا۔ اب آپ باتوں میں زیادہ وقت نہ لگائیے اور کاریگر کو کہیے کہ وہ بڑی جلد ٹانگ دے۔“

باسط نے ایک کی جگہ دو کاریگروں کو سعادت کا سوٹ دے دیا۔ اور کہا ”صاحب ناراض نہ ہو جائیں۔ یہ کام پلک جھپکتے میں تیار ہو جائے“ اور اس کے بعد ماسٹر باسٹ نے بڑے احترام سے آغا سعادت کو دکان کے اندر بٹھا دیا خدا جانے اس جگہ پر بٹھانے کے لیے باسٹ کی طرف سے اہتمام ہوا تھا یا نہیں لیکن یہ بات درست تھی کہ وہاں سے دکان کا کونہ کونہ نظر آتا تھا اور تمام وہ تصویریں جن میں اچھے سے اچھے سوٹوں میں ملبوس اکثر لڑکھانے انگیز کسی خوبصورت بلانڈ یا برونیٹ کے ساتھ ہوا خوری کے لیے جا رہے تھے، نظر آرہی تھیں۔ سامنے چار خانے کے ہینڈنگ کوٹ میں گھوڑے پر پاپلس فور میں گولف کی چھڑی کو کندھوں سے اوپر اٹھائے کوئی صاحب دکھائی دیتے تھے۔ ایک بڑی سی تصویر میں کاریگروں کی ڈانٹا اپنے کتے کو تھامے کھڑی نظر آتی تھی اور اس کا گون ہوا میں اڑا جا رہا تھا۔ ڈانٹا کا جسم لباس میں ہونے کے باوجود لباس سے علاحدہ نظر آتا تھا۔ اس کی پوشاک میں نظاہر درزی کی قدرت سے زیادہ خدا کی قدرت نظر آتی تھی۔ لیکن چونکہ ہر فنکار کا مقصد خالق کی قدرت کو سامنے کرنا اور آپ خالق کے انداز میں چھپ جانا ہے، اس لیے کسی ہوشیار کاریگر نے احتیاط کے ساتھ ایک بے احتیاطی سے پیدا کر دی تھی، ورنہ اگر وہ تصویر صرف خدا کی ہوتی تو باسٹ۔۔۔۔۔ لندن ڈپلومیڈ کٹر کی دکان کی بجائے شہر کے کسی کلال خانے میں ہوتی۔

اور یہ ڈانٹا کی تصویر پر ہی موقوف نہیں تھا، جہاں سعادت بیٹھا تھا

وہاں سے شیشوں کے اندر قد آدم مجھے نظر آتے تھے جو اتے سرخ سپید اور چپ تھے کہ ان سے ڈر لگتا تھا۔ شاید اس لیے کہ وہ چپ تھے، اگرچہ بولتے تھے! تمام کے تمام مختلف شیڈ کی لیڈی، ہبلٹین پہنے اپنے سر اپا کو دیکھ رہے تھے اور ان کے قریب ان بے آوازوں کی آواز، ماسٹر باسٹ فیتے کو بے پروائی سے گلے میں ڈالے، ڈانٹا اور لیڈی، ہبلٹین سے بے خبر اپنا حساب کتاب کر رہا تھا ابھی دن شروع بھی نہیں ہوا تھا کہ بن بھی وصول ہونے لگے۔ دو تین آدمی تو اس خاموشی کے ساتھ ہاتھ میں پیسے تھما گئے کہ وہاں چور بازار ہونے کا گمان ہوتا تھا۔ اگرچہ وہاں ایسا بازار ہونے کی گنجائش نہ تھی، صرف سینے سلانے کا کام تھا۔ شاید اچھی دکان کی نشانی یہی تھی، کہ اس کے چور بازار ہونے کا پتا چلے۔ سعادت کے دیکھتے دیکھتے ماسٹر باسٹ نے دو اڑھائی سو روپے اپنے رومال ٹاپ کی میز کے ایک ڈبے میں رکھ دیے اور ٹاپ کو کھینچ کر میز کی سطح کے برابر کر دیا۔ چابی بدستور گچھے میں تالے کے اندر لٹکی رہی ان روپوں میں ساٹھ روپوں کا سعادت خود اضافہ کرنے والا تھا۔

سعادت جھلا گیا۔ آخر اس نے گناہ کیا کیا ہے جو اسے روپے نہیں ملتے وہ انٹرویو میں کامیاب نہیں ہوتا۔ سوچتے سوچتے وہ صرف یہی سوچ سکا۔  
 آخر ماسٹر مجھے ممنون کرنے کے لیے میرا سوٹ جلدی نہیں تیار کر سکتا تھا، وہ ایک کاریگر کو زیادہ عرصہ بٹھا لیتا۔ زیادہ سے زیادہ یہی ہوتا، کہ اُسے چارچہ آئے اور ٹائم کے دینے پڑنے لیکن چیز تو مجھے وعدہ پر مل جاتی شاید باسٹ۔ لندن ڈیلومینڈ۔ ہونے کی وجہ سے کاریگروں کو وقت پر بلاتا اور وقت پر چھٹی دیتا ہے لیکن لندن سے ڈیلوما اس نے کپڑا کاٹنے کا لیا ہے۔ وقت کا ڈیلوما تو اپنا ہی ہے، اور اسے کاریگروں کی نسبت

اپنے گاہکوں کو زیادہ خوش رکھنا چاہیے۔ حالانکہ کام کرنے والوں کے اوقات سرکاری طور پر تصدیق ہونے کے بعد ڈانس کی تصویر کے نیچے لٹکے ہوئے تھے تاہم اس وقت سعادت شاپ اسٹنس ایکٹ کی بابت غور کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔

”پیسے کو میری زندگی میں دخل ہی نہیں۔ آخر اس کی کیا وجہ ہو سکتی ہے؟ سعادت نے پھر سوچا اور اب وہ باسط کی دکان سے باہر اس نئی سیاہ سڑک پر دیکھنے لگا جو سیدھی کمیشن کے دفتر تک چلی گئی تھی۔ جیسے کسی نے پیمانہ رکھ کر اس دکان اور دفتر کے درمیان پون ایک میل لمبا سیدھا خط لگا دیا ہو۔ سعادت نے غنودگی کی سی حالت میں پہلے اپنے سوٹ اور پھر سیدھی سڑک کی طرف دیکھا تو وہ اتنے اچھے کپڑے پہن کر اس سیدھی سڑک پر چلتا ہوا گیارہ بجے کمیشن کے دفتر میں پہنچ جائے گا اور ہر مہینے چپکے سے اڑھائی سو روپے جیب میں ڈال لیا کرے گا۔

پھر سعادت کو خود ہی ”چپکے سے“ کے الفاظ پر اعتراض ہوا۔ شاید اس لیے کہ رول ٹاپ پھراٹھایا گیا تھا اور ایک خانہ میں مزید روپے ڈالے گئے تھے۔ باسٹا مسکرا رہا تھا اور سعادت بوکھلا رہا تھا۔ سوٹ قریب قریب تیار تھا۔ سعادت نے اپنی سز فلیٹ کو ماتھے پر سرکایا اور باسط کے ہاتھوں کو نوٹ گنتے ہوئے دیکھا۔ سعادت نے سوچا ”اگر میں ٹیلی ماسٹر ہوتا“

”کھنڈے“ ماسٹر باسط نے اپنے ایک شاگرد کو پکارا۔

ایک شاگرد سامنے آیا جس کا ہونٹ کٹا ہوا تھا۔ وہ بہت ڈبلا پتلا اور نحیف و نزار تھا۔ اس نے گلوبند کے گرے ہوئے پلے کو گلے میں ڈالا اور کٹے ہوئے ہونٹ کے احساس کی وجہ سے نیچے کا ہونٹ اوپر کے ہونٹ کے

ساتھ بھینچنے لگا۔ اس نے گلوبند میں کھوڑا سا منہ چھپایا اور بولا۔ "جی! بس تیار ہے اور کھنڈے کے کاٹوں میں طلائی بیربلیاں کھیں۔ وہ مسلمان تھا لیکن وہ سونے کی ہندووانہ بیربلیاں اس کے کاٹوں میں ایک ایسے سوال کی صورت لٹک رہی تھیں جس کا جواب ہندو اور مسلمان لیڈر دینے کے ناقابل تھے۔" شام کے صاحب کی طرح اپنے منہ سے نکلتی ہوئی بجاپ کو دیکھتے ہوئے کھنڈا بولا "صبح سے انگلیاں سیدھی نہیں ہوتیں" اور اس نے انگلیوں کو دبایا اور بولا "پھر بھی آغا صاحب کو ساڑھے دس بجے تک سوٹ پہنا دوں گا" سعادت نے خوشنودی کے اظہار میں سر ہلایا۔

ماسٹر باسٹ نے رول ٹاپ کے قریب ایک صاف سطح پر فلائین ڈالی ہوئی تھی۔ اس نے فلائین پر ایک سفید خط ڈالتے ہوئے کہا "ہاں بس مجھے یہی کہنا تھا۔"

سعادت اپنی جگہ اور اس کے ماحول کی منظم سازش سے نکلا۔ آخر اسے اور سوٹ تو سلوانا ہی نہیں تھا اس لیے وہ وہاں سے اٹھ کر دکان سے باہر چوبی تختے پر ٹہلنے لگا اور بازار اور باہر کی غیر منظم چیزوں کو دیکھنے لگا۔ بے ربط شور سننے لگا۔ دفتر جانے والوں کے ساتھ اب اسکول کی چھوکریاں بھی نکل آئی تھیں اور اپنے سبک پانوں پر پھسلتی ہوئی کمیشن کے مخالف سمت چلنے لگیں۔ کہیں کہیں ایک دو جوڑے شاپنگ کرتے ہوئے دکھائی دینے لگے۔ چمڑے اور آئل کلاکھ کی دکان کا لوکر اور ایک کیمسٹ اپنی اپنی دکان کے بورڈ صاف کورسے تھے۔

باسٹ کے ہاں دو اور نوجوان داخل ہوئے۔ ایک کا سوٹ سل چمکا تھا اور دوسرا چمڑے کے لیے کپڑا لایا تھا۔ دکان کے اندر ایک درجن مشینوں کی





## کوکہ جلی

تھا اور دوسرے لوجوان کی پتلون کی کریمز بہت حد تک درست ہو گئی تھی۔ اور سعادت کو وہ لوجوان بلائڈ اور بروئیٹ کے ساتھ ہوا خوری کر رہے تھے، حرکت کرتے ہوئے نظر آنے لگے۔

اور کیبن کی تصویروں میں کتا بہت پیارا معلوم ہو رہا تھا۔ کتا کوٹا کیوں کہ اس سیٹنگ میں مغربی رواج کے مطابق "لیلیٰ اور سب لیلیٰ" مجھ سے محبت کرو، میرے کتے سے محبت کرو" کے انداز میں اکٹھے ہو گئے تھے۔ معلوم ہوتا تھا کارنروان کی ڈائنا اس تصویر سے اتر کر کیبن میں چلی آئی ہے اور باسط کا رول ٹاپ آہستہ آہستہ اوپر اٹھ رہا تھا۔

"یہ پھڈنا سا کیا لگا دیا ہے سوداں؟"

دوسری لڑکی جواب دیتی ہوئی دروازے میں کھڑی ہو گئی۔ پہلی لڑکی جس کی پیٹھ سعادت کی طرف تھی، کامنہ آئینہ میں نظر آنے لگا اور سعادت ایک جذبے کے ساتھ بیٹھا رہا دوسری لڑکی بولی۔ "ارے رواج ہے۔ پیٹھ پر بھی پھول سا بھار دیتے ہیں اور سینے پر بھی! مجھے تو تمہارا کپڑا بہت پسند ہے!"

"نرا ٹاٹ معلوم ہوتا ہے۔۔۔ سلا اچھا ہے، باسط جو ہوا۔۔۔"

دونوں ایک دوسرے کے کپڑے اور سلائی کو بہتر سمجھتی تھیں۔ لڑکی جس کا نام سوداں۔۔۔ مسعودہ بیگم تھا اس نے اپنے بال کو سن کر سٹائٹا کی طرح بنائے تھے۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ اس کا چہرہ لمبا کم تھا اور چوڑا زیادہ تھا اور یوں توازن قائم رہتا تھا۔ اس کی آنکھوں کے قدرتی پلوریں سرے کی ہلکی سی تحریر دکھائی دیتی تھی۔ وہی "مجھ سے محبت کرو۔ میرے کتے سے محبت کرو" انداز کی۔۔۔

دوسری لڑکی رنر کی طرح کم گو اور ٹیکھی تھی۔ بھوڑی اور مہنہ کے درمیان

ایک پھوڑے کا ہلکا سا داغ تھا لیکن اتنا ہی جتنا زیادہ نہیں ہوتا۔ اور ایک خوب صورت امتناعی حکم والے چہرے سے کم ہوتا ہے۔ اس کا نام سلطان تھا بہتی ہوئی لکیروں والا کوٹ اس کے جسم کے ابھار پر ابھرتا اور دباؤ پر دبتا پنڈلیوں کے وسط تک چلا آیا تھا۔ چھاتی پر خوب صورت قوسین بن رہی تھیں سعادت قوسوں کے لیے زکی انجس واقع ہوا تھا۔ وہ اپنے آپ سے بے خبر چھاتی اور کمر کی قوسوں کی طرف دیکھنے لگا۔

سعادت سلطان اور سوزاں کو دیکھتا رہا حتیٰ کہ ان لڑکیوں کو اپنی بے پردگی کا احساس ہونے لگا۔ سلطان نے بڑھ کر ہاتھ مارا اور پلائی وڈ کے کمرے کا پردہ پتیل کے چھلّوں کو پورے پھیلاؤ میں لے کر تن گیا۔ صرف ایک معمولی سی درز باقی رہ گئی۔

اس وقت کھنڈا سعادت کا سوٹ لے کر آیا اور ایک علاحدہ کینٹ میں لے جا کر پہنانے لگا۔ سعادت کے فیٹ کو سیدھا کیا، تاکہ وہ ایک شریف انسان نظر آئے۔ اور اس نے جلدی جلدی تیا سوٹ پہنا سوٹ بالکل درست تھا لیکن سعادت نے اس بات کا اعتراض ضروری سمجھا۔ کاروباری طور پر یہ بات درست نہ تھی "بغلوں کے قریب دبتا ہے" اس نے کھنڈے کو دکھاتے ہوئے کہا "اور یہ دیکھو فال سیدھی نہیں پڑتی... لیکن... لیکن... مجھے جلدی ہے۔"

کھنڈے نے گھٹنوں کے قریب سے قبلی سرکائی۔ انگشتانہ اتارا اور سوٹ کی جیبوں سے تمام کچے دھاگے نکال دیے۔ اس وقت لڑکیوں نے کھنڈے کو اشارے سے بلا یا کھنڈا معذرت کیے بغیر ادھر چلا گیا۔ لیکن سعادت نے احتجاج نہ کیا۔ کھنڈے کی وجہ سے سعادت اور ان لڑکیوں میں ایک رابطہ پیدا

ہو گیا تھا۔ سعادت کے پاس سے اُن لڑکیوں کے کیبن تک جانے میں یوں معلوم ہوتا تھا جیسے ان دو جگہوں کے درمیان ایک غیر مرئی خط لگ گیا ہے۔۔۔۔ اور یہی خط ہیں جو راستہ کاٹتے رہتے ہیں اور ایک دوسرے کی زندگی پر اثر انداز ہوتے ہیں۔

لڑکیوں کے کیبن میں بے احتیاطی سے داخل ہونے پر پردہ سرک گیا۔ اب سلطان کی پیٹھ سعادت کی طرف تھی۔ وہ پنجابی قمیص پہنے ہوئے تھی اور کمر کے نیچے قوسین بڑی بڑی اور کچھ خوفناک تھیں۔ ان لڑکیوں نے پردے کو اٹھا رہے دیا۔ شاید ان کی بے احتیاطی تھی وہ سیدھا تنکا نہ چاہتی تھیں اسی قدر بے حجابی کے ساتھ، جیسے سعادت دیکھ رہا تھا۔ لیکن سعادت کیا کر سکتا تھا۔ مرد کا انداز ہی کچھ سیدھا سیدھا، اُجڑا اُجڑا ہوتا ہے۔ لیکن عورت نگاہیں جھپکا کر ڈالتی ہے۔ جیسے اس کا جسم حسین قوسین کا مجموعہ ہے ویسے ہی اس کی نگاہیں اور اس کے افعال۔۔۔۔

سعادت کے جسم میں خون حرکت کرنے لگا۔ اسے اپنے کانوں کے کنارے جلتے ہوئے محسوس ہونے لگے۔ کھنڈے نے لڑکیوں کے کیبن میں داخل ہوتے ہی سلطان کا کوٹ کھینچا اور پھر اپنے آپ ایک بازو کی دوری پر جا کھڑا ہوا۔ یہ کار کیسے ہے، ذرا ٹھیک کر دو، سلطان بولی۔ کھنڈے نے ہاتھ بڑھا کر کار ٹھیک کر دیا اور پھر باہر نکلے ہوئے بولے بس بی بی جی۔ آپ کو کوٹ ایسا پسند آئے گا۔۔۔۔ جیسے۔۔۔۔ کبھی پسند نہیں آیا۔ کھنڈاڑک گیا اور بڑے زور سے دونوں ہونٹ بھینچنے لگا۔ اس وقت لڑکیاں ہنس رہی تھیں۔

یہ سازش تھی، سب سازش تھی۔ سعادت نے کہہ دیا، صاف کہہ دیا۔

لیکن وہ کوٹ اتار کر خود کچے دھاگے اتارنے میں مصروف ہو گیا۔ وہ ابھی تک اپنے سامنے دیکھ رہا تھا۔ مسعودہ نے بھی اپنا کوٹ اتار دیا تھا وہ کہہ رہی تھی ”باسط <sup>حسب</sup>، باسط نے حساب کتاب کا رجسٹر وہیں پھینکا اور کسین کی طرف آیا ایک لڑکی نے کپڑے کے ایک پلندے کو اٹھاتے ہوئے کہا ”ہمیں اور بھی کپڑے سلوانا ہیں“ لیکن ایک شرط پر۔ آج سے دوسرے ہفتے کے روز مل جائیں۔ مسعودہ سگم کی شادی ہے؟

مسعودہ شرمائی اور کہنے لگی ”یوں کپڑے مانگ لیتی ایک خاص تاریخ کو۔۔۔ میری شادی کا ذکر بھی کیا اتنا ضروری ہے کہ دنیا بھر۔۔۔“

”چلو ہٹو۔۔۔ ہٹو۔۔۔“ سلطان نے کہا:

باسط نے مسکرائے بغیر کہا ”شنیل ہے۔۔۔ شنیل کے گزلائیں کپڑا آپ؟“

”ایک گز عرض ہے۔ اور ساڑھے چھ گز بنے۔“

باسط اور کھنڈا دونوں کھڑے تھے۔ کھنڈے نے ایک نظر سے سو داں کے تندرست جسم کی طرف دیکھا گویا کہہ رہا ہو۔۔۔“ پونے سات گز ہو جانا تو اچھا تھا! لیکن وہ کچھ نہ بولا۔ شاید کھینچ کھانچ کر غرازا ہو جائے گا۔ مسعودہ کا چہرہ ابھی تک گلابی ہو رہا تھا۔ باسط نے آگے بڑھتے ہوئے سلطان سے کہا۔

”آپ کی قمیص شلوار کا ماپ تو ہے۔۔۔ مگر ان کا؟“

مسعودہ نے کہا ”تو ماپ لیجیے۔۔۔“

باسط نے کچھ دور جا کر اپنے رول ٹاپ کی چابی گھائی اور اسے پگھے سمیت اچھالنے اچھالنے ادھر چلا آیا۔ کمرے کے پاس پہنچتے ہی ماسٹر باسط نے

گلے سے فیئہ نکالا اور بولا

”آپ ذرا ہاتھ اٹھائیں“

مسعود بیگم نے دونوں ہاتھ پھیلا دیے اور سعادت کے گلے میں لعاب خشک ہو گیا۔ مسعودہ سامنے کھڑی تھی۔ ایک خوب صورت عورت — اپنی تمام قوس و قزح کے ساتھ۔ لیکن ماسٹر نے مسعودہ بیگم کے پیچھے سے فیئہ نکالا اور بولا: ”کھنڈے لکھ لے“

”چھائی اڑتیس“

پھر کمر بتیس... کراس بیک پندرہ، بازو بارہ، کلائی ساڑھے چار اور قمیص کی لمبائی کیا رکھوائیں گی آپ؟ — گز سے اوپر؟ — رواج نہیں — خیر پسند اپنی اپنی — شنیل اچھی ہے، اچھا انتخاب ہے — لیکن اس کے ماپ کی کیا ضرورت ہے؟ — اور شلوار — یہ فیئہ رکھے، ہاں ہاں رکھے اور فیئہ تو مسعودہ بیگم کے گلابی پائوڈر چھوڑتے ہوئے باسٹ اٹھ کھڑا ہوا۔ پھر اس نے فیئہ کو گلے میں ڈالا اور چلتا بنا۔

”عجیب ہوتی ہے! سعادت نے اپنی جگہ کھڑے کھڑے سوچا“ کتنا جذبات سے کورا — غیر شاعرانہ انسان ہے — اتنا بھی نہیں کہ ان خوب صورت قوسوں، ان گولائیوں کو دیکھ لے...“

اور سعادت مبہوت کھڑا سلطان اور مسعودہ کی طرف دیکھتا رہا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو کہنیاں مارتی ہوئی چل دیں۔ سعادت کو کچھ یاد آیا اور اس نے ماسٹر باسٹ کے رول ٹاپ پر ساٹھ روپے رکھے، اور گھبرا کر باہر نکلا۔ — انگلش واپچ کمپنی کا کلاک پونے بارہ بج رہا تھا اور انٹرویو کا وقت گزر چکا تھا! —

## ماسوا

بغلی کمرے سے ہنسی کی آواز آئی۔

میں بدستور اپنا کام کرتا گیا اگرچہ "جلیتی بی بی" بھی برابر ہنسی گئی جیتی کا کیا کھا وہ تو ہنستی ہی رہتی تھی... ایک عام بات جس پر کوئی مسکرانا تک گوارا نہ کرے جیتی کے لیے بڑا ہنسوڑ لطیفہ ہوتی تھی۔ "دیکھیے جی یہ ٹوپ چھڑی پر لٹکاوا ہے یا نہیں اور یہ چھڑی نہیں آدمی ہے۔" آدمی! اور جیتی کو ہم پڑھے لکھوں کے سلجھے ہوئے مزاح نے خراب نہیں کیا تھا۔ جیتی بی بی کے ہنسنے کی آواز میرے لیے غیر متعلق شور ہو کر رہ گئی تھی۔ متعلق اور غیر متعلق شور میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ مثلاً میں ایک دوست کے نام خط لکھ رہا ہوں جس میں مجھے ایک بدگمانی کو دور کرنا ہے۔ نہیں خط کو جانے دیجیے، شاید اس سے میرا مفہوم واضح نہ ہو سکے۔ فرض کیجیے میں ایک نظم لکھ رہا ہوں۔ چاند تاروں کے متعلق ایک نظم۔ جو ہمارے شاعر اکثر لکھا کرتے ہیں اور جس میں دھندلکے، اجنبی، آن گنت، مبہم، بے نام خلا وغیرہ کے سوا کچھ اور بھی ہوتا ہے، لیکن پڑوس کے سردار فتح، مونسہ، تویلیاں والے سپرٹن سوہلا پڑھنا شروع کر دیتے ہیں۔ "گلن میں تھال روی چند دیک



بنے تار کا سنڈلائنگ ہوتی ہے تو اگلے ہی لمحے سارا آسمان ایک وسیع و عریض  
 کھال کی صورت میں سامنے آجاتا ہے جس میں چاند اور سورج ڈوبے بن جاتے  
 ہیں اور تارے ان گنت موتیوں کی طرح کھال میں پڑے نظر آنے لگتے ہیں  
 اور یوں معلوم ہوتا ہے جیسے ایسے ہی وسیع و عریض پیمانے پر بھوکندن کی آرتی  
 اتر رہی ہے اور یوں کا جسم چنور دھوپ ملیان کی صورت میں ہل رہا ہے  
 ..... اب اتنی حسین منظر کشی کے بعد چاند تاروں کے متعلق کوئی کیا لکھے گا؟  
 برخلاف اس کے سامنے کے سروس اسٹیشن سے دن رات کاریں چلنے کا شور سنائی  
 دیتا ہے اور مستری بجلی کے فوارے کے ساتھ فحش کلامی بھی کرتا ہے۔ لیکن میں  
 لکھ سکتا ہوں پڑھ سکتا، سوچ سکتا ہوں، بلکہ ایسا شور مجھے زندگی کا قرب،  
 ایک قسم کے تحفظ کا احساس اور \_\_\_\_\_ نظم اس کے سوا دیتا ہے۔ اور یوں  
 غیر متعلق شور میرے لیے مدد و معاون ثابت ہو جاتا ہے۔ . . . .

لیکن آہستہ آہستہ جیتی کا شور "متعلق" ہو رہا تھا \_\_\_\_\_ کس کا دیا کھاتی ہوں

ان کا بڑا اور پھر ایک بڑے کی ناما نوس آواز آئی۔ ہمارے گھر میں یہ  
 دوسرا بوڑھا کون ہو سکتا ہے۔ یہ جیتی کے والد کی آواز نہ تھی۔ وہ ہمارے موتی  
 بازار میں آتے تھے لیکن گا ہے ما ہے اور وہ بھی قدامت پسند ہونے کی وجہ  
 سے اپنی جیتی کے گھر کا کچھ نہ کھاتے اگر کہیں زبردستی کوئی سنگترے کی پھانک  
 سنہ میں ڈال دے تو پورے سنگترے کی قیمت رکھ دیتے اور ہمیں یوں معلوم  
 ہوتا جیسے اچھی خاصی تجارت ہو سکتی ہے اور پھر جب وہ اپنی بیٹی کو نوکروں پر  
 رعب جاتے اور بچوں کو آیا کی گود میں دیکھتے تو ان کی آنکھوں میں پانی  
 آجاتا اور وہ پیار کا کوئی شدید کہے بغیر چل دیتے، آخر اس کی ضرورت بھی کیا  
 تھی۔ جب اپنا آپ بچوں کی صورت میں سکھی ہو جاتا ہے تو پھر موت پر کیوں نہ

کوئی شاد دیا نے بجائے... لیکن وہ بڈھا کوئی اور تھا ورنہ بابو جی میرے سسر ایسے بلغمی مزاج کے نہ تھے اور یوں ہنستے تھے جیسے کوئی آواز نکل کر ایک کھیلے میں گم ہو جاتی ہے۔ پھر جلتی کی آواز آئی۔۔۔۔۔ ان کا دیا کھاتی ہوں یہ تو مجھے پہلے ہی پتا تھا۔۔۔۔۔ کچھ اور بتاؤ؟... اور ہنسی....

میں اپنے کام کو ٹالتے ہوئے بغلی کمرے کی طرف چل دیا۔ کمرے تک جانے کی نوبت ہی نہ آئی دو یوں کمروں کے درمیان غسل خانے کے سامنے چھتا ہوا ایک چھوٹا سا برآمدہ کھا جو زمین سے دو تین فٹ اونچا تھا۔ اس کی سیڑھیوں پر ایک بوڑھا آدمی بیٹھا تھا اور اس کے سامنے لوہے کی ایک کرسی پر جس پر شکل سے کوئی بچہ بیٹھ سکے، جلتی بیٹھی اپنا ہاتھ اس بوڑھے کو دکھا رہی تھی۔ بوڑھے کا رنگ سُرخ تھا اور اس کے سر پر بے احتیاطی سے بندھی ہوئی گیروی پگڑی سے سطا بقت رکھتا تھا، اس کی ڈاڑھی سو پچھیس سفید ہونا چاہیے تھیں لیکن کٹیف سے تیل کے استعمال نے انھیں پیلا بنا دیا تھا.... "بیٹا ہنسو بہت تمہارا ہاتھ ہل جاتا ہے"۔۔۔۔۔ وہ کہہ رہا تھا اور ایک حقیر سے وقفے کے بعد سر کو جھٹکا دیتا تا کہ پگڑی پیچھے نہ گر جائے سر سے پانوں تک جوگی ہونے کے باوجود اس کی نسل سادھوؤں اور سپیروں سے یکسر علاحدہ تھی۔ اس میں کوئی ایسی بے نیازی نہ تھی اور نہ ہی تکرار طلب۔ دودھا دھاری ہونے کے باعث دودھ ہی پر گزارہ کر لیتا تھا۔۔۔۔۔ وہ خوش تھا۔۔۔۔۔ خوش! بالکل کائنات کا باپ بن کر، جاتی کا ہاتھ بھاسے ہوئے بولا۔۔۔۔۔

"یہ مارس کا گرٹول ہے" وہ ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں کہہ رہا تھا:

”یہ دیکھا جو ادھر جاتی ہے، اس کا مطلب ہے تم ٹریول بھی کر لو گی۔“  
 ”کدھر جاؤ گی؟“ جیتی بوچھرا سی تھی وہ کہہ رہا تھا۔۔۔۔۔ سمندر کا سفر  
 نہیں یوں کچھ جاترا معلوم ہوتی ہے۔“

میں نے کہا۔۔۔۔۔ ”جیتی تم اتنا شور مچا رہی ہو کہ میں۔۔۔۔۔“  
 ابھی میں نے فقرہ بھی پورا نہ کیا تھا کہ جیتی سنبہ پھلا کر روٹھ چکی تھی۔۔۔۔۔  
 تمہیں تو بس منڈیوں کے بولنے کی آواز بھی روک دے گی۔“ اس وقت تک  
 وہ بوڑھا رمال اور پامسٹ میری انگلی پکڑ کر مارس کے گرڈل پر رکھ چکا تھا۔  
 مانتا ہوں ہمارے سماج میں خاوند کا کھوج جل جاتا ہے۔ لیکن جس  
 آسانی سے وہ بڑھا مجھے جیتی کا شوہر سمجھ گیا تھا یہ بات میرے لیے کافی حیران  
 کن تھی اور پھر وہ یوں باتیں کرنے لگا گویا مجھے برسوں سے جانتا ہے۔ وہ فوراً  
 میرے ساتھ ایک رشتے میں داخل ہو چکا تھا، اس بات کو جانے بغیر کہ  
 میرے باوا کے باوا کا باوا۔۔۔۔۔ یہاں کچھ عقل گم ہو جاتی ہے ورنہ مجھے یہ  
 کیوں معلوم ہوتا ہے کہ اگر کوئی عورت بھی میری بیوی ہوتی تو اس کی وضع  
 قطع جیتی ایسی ہوتی۔ دس برس ہوئے مجھے بابو جی کا داماد بنے ہوئے لیکن  
 جب سے بابو جی پیدا ہوئے ہیں ان کا داماد تھا۔

تو مارس کے گرڈل کا مطلب تھا کہ کام کرو گے اور کھاؤ گے۔ میں نے  
 کہا، اگر یہ گرڈل جیتی کے ہاتھ میں ہے تو اس نے دو تین نوکر رکھے ہیں جن  
 پر حکومت کرتی ہے اور خود پلنگ پر بیٹھ کر موزے بنتی ہے، اپنے خاندان کے  
 لوگوں کے موزے ختم ہو جاتے ہیں تو اڑوس پڑوس کے شروع کر دیتی ہے۔“  
 جیتی بول اٹھتی ”نوکر تو نام ہی کے نا۔ سارا دن ان سے مغز کھپائی ہوتی ہے،  
 کوئی کام اپنے آپ بھی کرتے ہیں؟“۔۔۔۔۔ تو یہ بھی گرڈل کی تشریح اور پھر

موزے... اگر اس کے ہاتھ کی ریکھا میرے ہاتھ کے ساتھ بڑھی جائے  
تب کہیں وضاحت ہوتی تھی۔

لیکن جیتی خوش تھی۔ خوش اس بڑھے کی طرح۔ وہ دونوں ایک  
دوسرے کے اتنا ہی قریب تھے جتنا میں ان سے پرے تھا۔ میں ہر روز آسمان  
سے زمین پر آتا تھا۔ یہ لوگ کھوڑا بہت بھی آسمان کے طرف جاتے تو بے حد  
خوش ہوتے لیکن میرا آسمان بدرجہ اوچا ہو رہا تھا۔ جیتی کے لیے یہ بات  
پریشان کن نہ تھی کہ وہ میری قسمت کا کھاتی ہے۔ عورت اور کمائی! کچھ طوائفوں  
ایسی بات معلوم ہوتی ہے، باوجود اس بات کے کہ میرے غلاموں کا حلقہ وسیع ہوتا  
تھا مجھے یہ بات اچھی نہ لگی۔ لیکن یوں نہ اچھا لگنے میں جو اچھا لگتا ہے اس نخوت کا کوئی کیا کرے۔  
تو بڑھے نے جتنی باتیں بتائیں وہ ایسی کھیں کہ ہم ان پر یقین کرنا پسند  
کرتے تھے، کہیں کھوڑا بہت رد و بدل ہوتا تھا لیکن وہ ہمیں پریشان کرنے  
کے لیے کافی نہ تھا۔ مثلاً یہ کہ روی وار کے دن جو ہم کالی گائے لاتے ہیں، یہ پھلے  
گی نہیں شاید اسی لیے پکڑا مر گیا تھا اور سوا لگوانے کی وجہ سے گائے کا ایک  
کھن ہمیشہ کے لیے بند ہو گیا تھا۔ لیکن ایسی بات کو صرف ایک اتفاق کہہ کر ٹالا  
جا سکتا ہے اور انسان صاف کہہ سکتا ہے اس کا قسمت سے کوئی سمبندھ نہیں  
البتہ دوسری بات جو تشویشناک ہو سکتی ہے، وہ یہ تھی کہ یوگ بڑا ہو کر ہمیں تنگ  
کرے گا۔ سوا بھی آٹھ دس سال پڑے تھے یوگ کے بڑا ہونے میں۔

برخلاف اس کے ہمارے حق میں کتنی باتیں کھیں۔ قسمت کی لکیروں اور  
دماغ کی ریکھا کو کاٹتی ہوئی شہادت کی انگلی کی طرف جھکتی تھی۔ وہاں زحل  
کی ایک پہاڑی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ زندگی بھر ہمیں معاش کی فکر نہ  
ہو گی اور آخری عمر میں "راج دربار ہیں بڑا مان" پائیں گے۔ یہ بات بھی مجھے

اچھی نہ لگی، خیر... دروازے پر ہلکی سی کھٹ کھٹ سنائی دی۔ بابو جی کی آواز تھی۔ انھیں کا انداز تھا کہ دروازے کے شیشوں پر چھڑی سے ہلکی ہلکی ضربیں لگاتے اور کسی کا نام پکارنے کے بجائے ایک ریٹنگتی ہوئی آواز میں ہری او... .. م... .. م... .. کہتے۔

آج بابو جی نے پگڑی بھی ایسی باندھی تھی جس پر شلوک لکھے تھے۔ ایسی پگڑیاں ہر دوار میں ملتی تھیں اور ان کے ایک پلو میں بیٹھے چنے، بھنے ہوئے چاول پر شاد کے طور پر ملتے تھے۔ آج چھڑی بھی مختلف تھی۔ یہ شکھر چین لکڑی کی بنی ہوئی تھی۔ جس پر پھوڑے، ہی پھوڑے نظر آتے اور یہ چھڑی گھر میں ساپ بھگانے کا بہترین نسخہ تھی۔ جلتی اپنے پوجیہ پتا جی کی طرف متوجہ ہوئی اور بڈھا اٹھ کر کھڑا ہو گیا گویا وہ پیسے نہیں لے گا، البتہ اخبار والے اور کوئلے والے کی طرح مقررہ تاریخ پر چکانے آئے گا لیکن میں کچھ نقدی اس کی سٹھی میں کھا چکا تھا۔

”یہ میں نہیں لوں گا بیٹا“ اس نے کہا:

”کیوں بابا کیوں نہیں لوگے؟“

بڈھے نے اپنی رمل اور وہ کتاب جس پر ہندی کے بے شمار زاپکے بنے ہوئے تھے، اٹھائی، اسے بھاڑا، چوما، آنکھوں اور سر سے لگایا اور اپنی جھولی میں رکھ لیا، اس وقت تک اس کے چہرے سے خوشی زائل ہو چکی تھی اور اداسی کے تاثرات نظر آنے لگے تھے۔ وہ بوڑھا ان لوگوں میں سے تھا جو خوشی کے وقت خوش اور غمی کے وقت غمگین ہوتے ہیں۔ ایک دن میں دس بار سنتے اور پانچ چھ بار رو بھی لیتے ہیں اور ایک ہی تاثر کو مستقل نہیں ہونے دیتے۔ بڈھے نے کہا بیٹا! میں پیسے نہیں لوں گا، جو خبر میں تمہیں

سنانا چاہتا ہوں وہ اچھی نہیں ہے۔ ہاتھ دکھاؤ۔“

جیتی کے والد اس اثنا میں بڑے اطمینان کے ساتھ کشمیری آسن پر  
 براجمان پوچکے تھے جیتی انھیں بابا کی باتیں سنا کر ہنس رہی تھی، بوڑھے نے  
 منفاہمت کے انداز سے اس کی طرف دیکھا اور ایک قہقہہ کہیں پھیلی میں گم  
 ہو کر رہ گیا۔ پھر بوڑھے نے سنجیدہ سامنے بناتے ہوئے کہا: ”بیٹا! بُرا تو  
 نہیں مانو گے، اداس تو نہیں ہو گے“ میں نے کہا: ”بابا جتنا میں اداس نظر  
 آتا ہوں اس سے زیادہ اور کیا ہوں گا؟“۔ ”نہیں نہیں بڑھا ہنسا۔۔۔۔۔“  
 قریب بابو جی یوگ کی باتیں سن کر اس سے لاڈ کر رہے تھے۔۔۔۔۔ باہر جو  
 دروازہ اندرونی صحن میں کھلتا تھا، حویلیاں والے سردار کی آواز اس  
 میں سے ہو کر آرہی تھی۔ وہ گارنہ تھے۔۔۔۔۔ لال رنگ نس کو لگا  
 لال رنگ اُسے لگتا ہے جو بہت خوش نصیب ہوتا ہے۔ یہ دوسرے  
 مصرع کا موضوع تھا لیکن بڑھے نے میرا ہاتھ پکڑ کر کہا: ”یہ ہنستی کھیلتی  
 سورت چپکے سے چل دے گی۔“  
 میں نے گھبرا کر کہا: ”کیا؟“  
 بڑھے نے نقدی واپس میرے ہاتھ میں کھاتے ہوئے کہا: ”جیتی  
 بہت دیر جیتی نہ رہے گی اور۔۔۔۔۔“

”اور؟“

”اور تمہاری دوسری شادی ہو گی؟“

یوں تو میں ہر اس بات کو مان لیتا ہوں جس کے لیے میں نے دام  
 دیے ہوں، لیکن سب سے زیادہ اس بات کا قائل ہوتا ہوں جس کے لیے  
 کوئی دام قبول نہ کرے۔ کوئی آدمی چیز دے اور چل دے تو یہ چل

دنیا ہمیں کتنا مرتباً نہ معلوم ہوتا ہے۔۔۔ جو یلیاں والے کی آواز نے مجھے جھنجھلا دیا تھا بوڑھے کی بتائی ہوئی خبر لال رنگ نہ ہو سکتی تھی، لیکن میں اپنے کام کو چھوڑ کر سروس اسٹیشن کے سامنے بوڑھے کو جاتے دیکھا کیا اس کی بغلوں اور اس کی چھائی پر خاصی چربی ہونے کے باعث بوڑھے کے بازو ہسنگی کے انداز میں ہل رہے تھے وہ کھڑا رہتا تو میں کچھ بھی محسوس نہ کرتا لیکن اس نے بات کہی اور چل دیا!۔۔۔ وہ سرخ اور سفید، بھاری بھر کم آدمی اس قدر زندہ تھا کہ اس کے ہوتے ہوئے موت کے لیے کوئی جگہ نہ تھی۔ لیکن اب اس کی چھوڑی ہوئی خالی جگہ شمشان کی طرح بھائیں بھائیں کر رہی تھی۔۔۔ وہ چلا گیا اور صاف معلوم ہوتا تھا کہ اس کے بوجھ سے دبی ہوئی سیمنٹ کی سیڑھیاں آہستہ آہستہ اپنی سطح پر آ رہی ہیں۔ کوئی تیز لاپٹ پانی سے گزر جائے تو پانی میں ایک گھاؤ سا پیدا ہوتا ہے۔ اس طرح مجھے اس بوڑھے کے پیچھے ایک گھاؤ سا نظر آ رہا تھا اور ارد گرد کی فضا اس گھاؤ کو پانٹنے کے لیے چاروں طرف سے آسنڈی دکھائی دیتی تھی۔

آج سروس اسٹیشن خاموش تھا، اسلامی بھائی ہونے کے باعث سروس اسٹیشن کا مالک جمعہ کے دن دکان بند رکھتا تھا۔ سو آج وہاں کچھ بھی نہ تھا چند آوارہ کتے ایک مریل سے کتے کو ڈھکیلتے ہوئے کاروں کے پلیٹ فارم کے نیچے خانی جگہ تیں گھس گئے تھے۔ اور اسی دم چلے بھی گئے۔ تو گویا وہاں فقط اس سروس اسٹیشن کی عمارت گھری تھی۔ جس کے پیچھے سیوبیر کا اکیلا درخت پچھلے روز کی بارش میں ڈھلا ہوا، اپنی سرسبزی سے آنکھوں میں کھپا جاتا تھا۔ بائیں طرف جنگل کے پیچھے ہوا بھرنے والی موٹر نظر آ رہی تھی اور اس پر ابر یعنی ہوا کے حروف انگریزی میں اتنے موٹے لکھے ہوئے تھے کہ ان کے



لکھے ہونے میں خواہ مخواہ شک پیدا ہوتا تھا۔ . . . .  
 بوڑھے نے بات کہی اور چل دیا۔ . . . . وہ ابھی تک بازار میں اس جگہ  
 پہنچا تھا، جہاں رنگ ریز اور ان کے شاگرد مل کر پگڑیاں سکھا رہے تھے، بوڑھا  
 دم بھر کے لیے صافے کے پیچھے اوجھل ہو گیا۔ لیکن اسی دم پھر سامنے آ گیا۔ ابھی  
 وہ ایک سے بچنے کے لیے گلی کی پناہ میں گیا ہی تھا کہ دو بچے لڑتے ہوئے بوڑھے سے بھر گئے۔ بوڑھے  
 کی پگڑی پیچھے کی طرف سرک سئی، جسے اس نے ٹھیک کیا اور بچوں کو چمکا  
 کر آگے چل دیا۔۔۔۔۔ آخر اسے نظروں سے اوجھل ہونا تھا سو وہ ہو گیا  
 رسوئی سے پلیٹ کے گرنے کی آواز آئی، شاید آیا کے ہاتھ سے گری تھی  
 چونکہ اسے اکثر بے احتیاطی کے باعث ڈانٹ پڑتی اس لیے اس کے ہاتھ کانپتے  
 رہتے تھے۔ نوکروں کے کواٹروں میں جو تیل کا ایمپ جلا یا جاتا تھا اس کی  
 چمٹی دو تین چار بار پھوڑ چکی تھی۔ لیکن یوں معلوم ہوتا تھا جیسے جلتی نے پھر  
 سے اس کا پلیٹ توڑنے کا قصور معاف کیا ہے، کاش پہلی بار جب اس  
 سے چیز ٹوٹی تھی، اس وقت کوئی اس کے گناہ کو معاف کر دیتا تو توبت  
 یہاں تک نہ پہنچتی۔ . . . ہری اوم کی آواز کے ساتھ بابو جی کے پیٹ سے  
 ایک خاص قسم کی آواز نکلی جو پیٹ کے یکسر خالی ہونے پر پیدا ہوتی ہے یا  
 بہت کھا لینے کے بعد سننے میں آتی ہے۔ ساتھ ہی پتا چلا کہ مجھے پکارا جا رہا

۴

میں نے کہا۔ "جی، آپ مجھے بلا رہے ہیں؟"  
 "ہاں بھاگیرتھ، بات سنو۔۔۔۔۔ جیسے میرے اپنے انداز سے آواز آئی  
 "جلیتی کو کہو ورزش کیا کرے؟"  
 "ورزش کیا کرے؟ وہ تو پہلے ہی گھر کے کام کاج تلے دی ہوئی ہے؟"

” لیکن بابو جی — نوکر بھی بھلا اپنے کام کرتے ہیں۔ جب تک بیوی خود ہاتھ پاؤں ہلائے، کون جان مارتا ہے اب جو یہ سب ہنکھے، جھلکورے قرینے سے دھرے ہوئے ہیں، نوکروں نے دھرے ہیں، سنگا سر لگ کر صوفے کی پشت میلی ہو جائے، کیا مجال جو نوکر کہیں اس پر کپڑا ڈال دیں یا اسے پکڑ کر دھو ڈالیں؟ ”  
 ” تو یہ دھونے دھلانے کا کام کون کرتا ہے؟ ”  
 ” جیتی ”

” یہ تو اچھی بات ہے، بیٹا، اصل ورزش تو یہی ہے تاکہ بنا مطلب ناپتے پھرنا شہر کی گلیاں سیر کے بہانے ”  
 ” عورت کے لیے سب سے اچھی ورزش گھر کا کام کاج ہے۔ جس سے اس کا شیر گٹھا رہتا ہے، اور وہ بیمار نہیں ہوتی، کپڑے دھونے سے باز رہتی اور چھاتی میں طاقت آتی ہے، کام نہ کیا تو سوٹی ہو جائے گی؟ ”  
 جیتی کو پتا چلا تو وہ بدستور ہنستی ہوئی باہر آئی۔ ” بابو جی آپ بھی حد ہیں۔ آپ کو چاہیے میری طرف داری کریں، آپ اٹھا مجھے کام کرنے کے لیے کہتے ہیں تو میں کام نہیں کرتی؟ سارا دن سینا پرونا، کتر بیونت کے علاوہ کپڑے دھونا، حتیٰ کہ برتن بھی مجھے ہی مابھنا پڑتے ہیں، گن آنند کی تو یہ کوشش ہوتی ہے، ذرا بی بی آنکھ ادھر کرے اور وہ جھٹ سے سارے جھوٹے برتن گرم پانی میں ڈال دے اور مابھنے نہیں اور جھاڑ پونچھ کر برتن پر لگا دے ”

” تو تو د کام کرتی ہے، یہ سن کر مجھے بڑی خوشی ہوئی ” — بابو جی کہہ رہے تھے لیکن ایک بات سے انھیں بھی اتفاق تھا کہ برتن نہیں صاف کرنے چاہئیں، وہ بہو بیٹی سے سرد ہوانے جوتا اٹھوانے، چلم بھروانے اور ایسے پتخ کام کروانے کے خلاف تھے نہ اپنے بیٹے کا کپڑا کسی بہو بیٹی کو دیتے نہ ان کا



بچے، باجی کے لیے حقہ ڈال دے۔ جواب میں پھر جی ہو کی آواز آئی۔ اس اثنا میں بابو جی اپنی جیب سے تمباکو نکال چکے تھے اور میری طرف بڑھا رہے تھے، پٹوسیوں کا موزہ، جلیتی کی سلائیوں پر لمبا ہوتا جا رہا تھا۔ جب وہ تیسری سلائی ڈالتی اور دایاں بایاں ہاتھ اکٹھا جھٹکتی تو ساکتہ ہی اس کے پتلے نمدار ہونٹ سمٹ جاتے، میری نگاہوں کے قریب سے کہیں ایک کرن اس کے ہونٹوں پر پہنچ کر کھیل جاتی تھی۔ اس وقت وہ بابو جی کی طرف اشارہ کرتی اور میں چھپ جاتا۔ پہلے میں جلیتی بیٹی کو دیکھ رہا تھا، پھر جلیتی ماں کو دیکھنے لگا۔ اب میرے سامنے جلیتی تھی۔ عورت۔۔۔۔۔ میری نگاہیں اس کے خوبصورت جسم اس کے ہت کی پیمائش کرتی ہوئی کو لھوں پر آرکیں۔ درزی نے بانٹاتے ہیں سے دو دوریشے کھینچ کر کمر کے قریب قبضہ کو کس دیا تھا اور جلیتی کے اوپر اور نیچے کے جسم کی حد بڑی صفائی سے باندھ دی تھی۔ درمیان کا جسم کپڑے کے نیچے یوں معلوم ہو رہا تھا گویا ایک بھوری سی بلی آگ کے پاس سے اٹھ رہی ہے اور کمر کو باقی جسم سے اوپر اٹھا کر کھڑی کر رہی ہے۔۔۔۔۔ اور اس کے بعد یوں نظر آنے لگا جیسے بہت بڑے پینڈے والی ستار پڑی ہے۔۔۔

اس وقت تک گن آنند بابو جی کے لیے حقہ ڈال چکا تھا بلکہ بابو جی بھی تمباکو چلم میں پھینک چکے تھے، جلیتی میری نگاہوں کی تاب نہ لا کر شرما چکی تھی بیٹی اور ماں کی صورت میں جو وقار جلیتی کے چہرے پر ہوتا تھا ایسا ہی وقار عورت ہونے پر بھی قائم رہتا، بلکہ وہ کبھی یوں سر اٹھاتی جیسے کہہ رہی ہو۔

میں ہوں! لیکن میں اپنی نگاہوں کی فحاشی سے اکثر اسے اس کے مفعول ہونے کا یقین دلا دیتا اس وقت وہ نہایت بے بس ہوتی اور میں اچھے ہتھیاروں کی مدد سے وہ لڑائی جیت لیتا ورنہ قاعدے کی لڑائی میں عورت سے کون

کبھی جینا ہے؟

میں اپنے کمرے میں چلا گیا اور نئے سرے سے اپنے دوست کی بدگمانی دور کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ میں نے اس کے نام ایک بے سرو پا لمبا پوڑا خط لکھا، کیوں کہ میں اس کی دوستی کی قدر کرتا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ محض اس بات پر مجھ سے ناراض ہو جائے کہ میں نے ایک معمولی سی پارٹی میں اس کا تعارف عورتوں سے نہیں کروایا۔ میں جانتا ہوں وہ اس محفل میں محض چائے پینے کی غرض سے نہیں بلایا گیا تھا اور مجھے عورتوں کے علاوہ اس شام کے مہمان کے ساتھ بھی اسے ملانا چاہیے تھا لیکن قصہ یہ تھا کہ میں تو مہمانوں کے سواگت میں لگا ہوا تھا اور یہ تعارف کا کام کسی دوسرے کے سپرد تھا۔ یا شاید میں نے اپنے دوست کو بہت اپنا بھی سمجھ لیا تھا اور اس لیے بنا جانے بوجھے مجھ سے یہ غلطی ہوئی۔۔۔

لیکن میں بہت دیر تک خط کے متعلق سوچ بھی نہ سکا۔ اس وقت شام ہو چکی تھی اور دائیں طرف کے مکان میں اوپر کے فلیٹ پر روشنی اور سائے آپس میں گھل مل گئے تھے، کمروں میں ابھی بتیاں نہیں جلی تھیں فقط کچھ دوپٹے ادھر ادھر حرکت کرتے نظر آ رہے تھے، سامنے سڑک پر پل بھر کے لیے بتی جلی اور پھر بجھ گئی معلوم ہوتا تھا بجلی کمپنی والوں نے آزمائشی طور پر ان بتیوں کو روشن کیا ہے۔ میں پھر جیتی کے متعلق سوچنے لگا۔۔۔ مجھے دوسری شادی کسی قیمت پر منظور نہ تھی۔

میں نے قلم کو میز پر رکھا اور کرسی میں اکڑوں بیٹھ کر دونوں گھٹنوں کو اپنے ہی بازوؤں میں بھینچ لیا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی بھنگی کمپنی سے باہر تنخواہ لینے کے لیے بیٹھا ہے۔ میری ٹھوڑی بڑے آرام سے

گھٹنوں پر ٹکی ہوئی تھی یہ بات نہیں کہ اس بھوڑی کو اکٹھائے پھر نابوجھل معلوم ہو رہا تھا بلکہ یہ اس لیے تھا کہ اس طور بیٹھنے سے میں ما فیہا سے بے خبر سوچ سکتا تھا۔ چنانچہ میں دنیا جہان کی باتیں سوچنے لگا۔ اس دنیا جہان کی باتیں جن سے جیتی متعلق تھی —

شادی کے بعد پانچ چھ سال تو ہم نے ایک دوسرے کو سمجھے میں لگا دیے۔۔۔ میری ماں مر گئی تھی۔ اس لیے مجھ میں خواہ مخواہ یہ احساس پیدا ہو گیا کہ جیتی میرے یتیم بہن بھائیوں کو اچھی طرح نہ رکھے گی۔ مجھے وہ شدید اختلاف کا دن یاد ہے جب جیتی نے میرے بہن بھائیوں کی نسبت مجھے اچھا کھانا دیا۔ میری ہدایات کے خلاف! اور میں نے انتہائی غصے میں برتن باہر پھینک دیے تھے۔

جہاں بھی کبھی اس قدر اختلاف ہوتا تھا، جیتی دب جایا کرتی تھی حالانکہ اسے دینا نہیں چاہیے تھا۔ میرا تجربہ ہے کہ جب کوئی عورت بہت شوہر پرست ہو جائے اور خاوند کی بے ہودہ باتوں کے خلاف بھی احتجاج نہ کرے تو شوہر مزید بے ہودہ باتیں کرتا ہے اور کسی بات کو بے ہودہ نہیں سمجھتا۔ برخلاف اس کے جب عورت شور مچاتی ہے اور محلے والوں کو اکٹھا کر لیتی ہے اور نام نہاد شرافت سے سہمی نہیں رہتی تو مرد زیادہ سے زیادہ ایک دو بار ایسا شور مچاتا ہونے دیکھتا ہے، اس کے بعد وہ راہ راست پر آجاتا ہے۔ ہر شخص میں جھگڑنے سے بچنے کی قدرتی خواہش ہوتی ہے۔ اس امتحان کے باوجود اگر کوئی مرد جھگڑا لو ثابت ہو تو پھر اس کا کوئی علاج نہیں سوائے اس کے کہ مرد، عورت علاحدہ علاحدہ ہو جائیں۔ اس دن بھی محلے کے لوگ اکٹھے ہو گئے، عورتوں اور مردوں نے مل کر مجھے شرمسار کیا۔ اور میں خود ہی جا کر

سڑک پر سے برتن اٹھا لایا۔

”بات یہ ہے کہ عورتیں ہی عورتوں کو خراب کرتی ہیں“ وہ کہنے لگیں  
جیتی نے اگر تمہیں اچھا کھانا دیا ہے تو بہت اچھا کیا ہے۔ یہ تو ایک اچھی عورت  
کی صفات میں سے ہے۔ جیتی کہہ رہی تھی، گھر بھر میں مرد ہمشیر سب سے اچھا کھاتا،  
اور سب سے اچھا پہنتا ہے، اُس کے بعد کسی کی باری آتی ہے۔ میں اپنے بچے کو  
دکھانا نہیں دیتی جو آپ کو دیتی ہوں۔ ہاں اگر میرے اپنے بچے اور تمہارے  
بہن بھائیوں کے کھانے میں فرق ہو تو مجھے جو ٹیٹ سے پکڑ لو۔۔۔“

اس وقت جب میں یہ باتیں سوچ رہا تھا تو پھر پھڑی کے زمین پر  
لگنے کی آوازیں آئیں۔ معلوم ہوا بابا بوجی اپنے ہاں جا رہے ہیں اور ان کی  
سکھ چین ایک باقاعدہ وقفے کے ساتھ زمین پر پڑ رہی تھی۔ جاتے ہوئے  
بھی ہری اوم کی آواز کانوں میں پڑی۔ اس وقت وہ اکیلے نہیں جا رہے تھے  
بلکہ یوگ کو بھی اس کے نہیال لے جا رہے تھے۔ کمرے کا پٹا آہستہ سے کھلا  
اور آواز آئی۔ ”بھاگیرتھ بیٹا! میں جا رہا ہوں۔“

میں نے وہیں سے آواز کی طرف رخ کرتے ہوئے کہا۔۔۔۔ پھر کب  
آؤ گے باجی؟

”اب جیتی کو کہو نا دو مین مہینے کے لیے ہمارے ہاں جلی آئے“

”اب بھی تو آپ ہی کے ہاں ہے“

”نہیں میرا مطلب ہے۔“ بابا بوجی کہہ رہے تھے۔ ”میں اس سال

ویشنو دیوی جا رہا ہوں جیتی بھی میرے ساتھ جلی جائے“

”اچھا باجی۔۔۔ ابھی راستہ کھلنے میں دیر ہے، سوچ لیں۔“

پر نام!



یوگ نے دروازے سے منہ نکال کر مجھے لکڑی کا اجن دکھایا۔ یہ غالباً باجو جی لائے تھے، اجن دکھاتے ہی وہ اونچی آوازیں ہنس کر اپنے نانا کے ساتھ ہو لیا۔ میں کرسی میں ذرا سا ہلا تو اسے خیال آیا کہ میں اسے تنہیاں نہیں جانے دوں گا اس لیے وہ فوراً بھاگ گیا۔

جیتی ایک خدا داد ذہن کی مالک تھی وہ معمولی سی ہندی جانتی تھی اور بس اسے کسی طور پر پڑھے لکھے ہونا نہیں کہا جاسکتا۔ اس کے باوجود میں کبھی اسے انگریزی فلم دیکھنے کے لیے لیجاتا تو وہ فلم کی ساری کہانی سمجھ جاتی جزوی تفصیل اور گفتگو کے متعلق وہ لغزش کھا جائے تو کھا جائے لیکن چیز کا مفہوم اور کہانی کے مرکزی خیال پر پہنچتے ہوئے اسے کبھی دیر نہ لگتی۔ بلکہ جب کبھی میں اپنی عادت کے مطابق بے توجہ ہوتا اور اس سے پوچھتا۔ اب کیا ہوا تو وہ چند ہی لفظوں میں تسلسل قائم کر دیتی۔۔۔۔۔ لیکن ان خوبیوں کے باوجود جیتی میں شدید نقائص تھے۔ مثلاً یہ کہ وہ کسی کی پوری بات نہ سنتی تھی۔ درمیان میں بولنے لگتی، دوسرے یہ کہ وہ جھوٹ کو بالکل برداشت نہ کر سکتی تھی۔ وہ فوراً دروغ یا ف کے منہ پر کپہ دیتی کہ یہ جھوٹ ہے حالانکہ یہ اخلاق کے منافی ہے۔۔۔۔۔ جھوٹ اس کی برداشت سے باہر تھا اس لیے رشتے دار اس سے نالاں رہتے تھے وہ لاگ لپٹ کے ساتھ بات کرتے تھے، لیکن جیتی انھیں اس بات کی اجازت نہیں دیتی تھی۔

میری عادت ہے میں حالات کا مقابلہ کرنے سے جی پراتا ہوں۔ مثلاً مجھے اپنے کرایہ دار سے کرایہ مانگنا پڑے تو میں اس سے نہیں مانگوں گا، تا وقتیکہ وہ مجھے خود نہ دے دے یا کوئی ایسی بات کرنے سے احتراز کروں گا جس سے میرے دل کا امن و امان تباہ ہو جائے۔ لیکن ایسے

میں جیتی عین مقام پر پہنچ کر دو ٹوک فیصلہ کر دیتی ہے۔ جہاں میں امن و امان کے متعلق سوچتے رہنے سے اپنے دل کا سکون کھو بیٹھتا ہوں، وہاں ڈر لڑ جھگڑ کر ایک مستقل قسم کے سکون کی بنیاد رکھ دیتی ہے۔ جیتی میرا مرد ہے اور میں اس کی عورت ہوں..... اور میں کیسے برداشت کر سکوں گا کہ یہ عورت مر جائے اور میں دوسری شادی کر لوں۔

سردار فتح سنگھ تو لیلیاں والے دروازے میں نمودار ہوئے اور میرے خیالات کا سلسلہ تھوڑی دیر کے لیے منقطع ہو گیا۔ ان کے ہاتھ میں ایک لفافہ تھا جو ڈاکہ غلطی سے ان کے برآمدے میں پھینک گیا تھا۔ میں نے کہا: "شکریہ سردار صاحب! سردار صاحب جو اب میں مسکرا دیے اور ایک قدم پیچھے ہٹ کر بولے گویا کوئی بات اتفاقاً یاد آگئی ہو۔" آج نہیں اڑے گی کیا؟ میں نے کہا "سردار جی آج میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے"..... اچھا اچھا۔ ہا ہا! اچھا۔ اور سردار صاحب ہل دیے۔ جیتی وہاں ہوئی تو فوراً کہہ دیتی کہ دسکی والی بات سردار صاحب کو اتفاقاً یاد نہیں آئی، بلکہ وہ کچھ دیر پہلے ضرور اس کے متعلق سوچتے رہے ہوں گے، گذشتہ بارش کے روز سے اکھنوں نے ابر سے خوب فائدہ اٹھایا تھا اور آج بھی بادل آسمان پر ادھر ادھر بکھرے نظر آ رہے تھے جنہیں سردار صاحب اپنے تحلیل میں یکجا کر رہے تھے۔ شام کے وقت دھند آسمان سے نیچے اتر آئی تھی اور سڑک پر بجلی کی بتی ایک محدود سار قبہ روشن کرنے کے علاوہ اور کچھ نہ کر سکتی تھی۔ فقط سردس اس اسٹیشن اور سیو بیر کے درخت دو بلند قامت سایوں کی صورت میں نظر آ رہے تھے۔

مجھے خیال آیا کہ اگر جیتی میری جگہ ہوتی تو اس لفافے کو بھی محض مجھ



کلدیپ بھی جیتی کی طرح خداداد ذہن کا مالک تھا اور پھر اس پر پڑھا لکھا آدمی مجھے وہ دن یاد آئے جب میں انگیٹھی کے پاس بیٹھ کر اس کے ساتھ گھنٹوں باتیں کیا کرتا تھا۔ کلدیپ اخلاق کا مجسمہ تھا، لیکن اس معمولی سی بات پر اس نے مجھے الوداع کہنا مناسب سمجھا.....

ایک دن میں نے اسے کہا "کوئی آدمی جھوٹ بول رہا ہو اور تمہیں پتا چل جائے کہ وہ سراسر دروغ گوئی سے کام لے رہا ہے تو کیا تم اسے ٹوک دو گے؟"

کلدیپ نے کہا "موقع کی بات ہے؛"

ظاہر ہے، میرے سن میں اس وقت بھی جیتی ہی تھی۔ چنانچہ میں نے اپنے ایک بوڑھے دوست کا قصہ سنایا۔ میں نے کہا۔ رفیق ہے نا میرا دوست وہ ایک دن قصہ سنارہا تھا کہ میں اپنے ایک دوست کے ہاں جایا کرتا تھا اگرچہ یہ بات مخرب الاخلاق نظر آتی ہے لیکن ہا ہا دل ہی تو ہے۔ اس دوست کی بہن سے میری محبت ہو گئی، میں نے کہا بھئی ہاں۔ ممکن تو ہے۔ رفیق نے کہا۔ "یہ سری نگر کا واقعہ ہے۔ میرا دوست ایسے مکان میں رہتا تھا جس کا دروازہ دریائے جہلم کی طرف کھلتا تھا۔ میں نے کہا۔ "ہاں دروازہ بھی جہلم کی طرف کھل سکتا ہے۔" میں نے کلدیپ کو صاف صاف کہہ دیا کہ رفیق کے گذشتہ اطوار کی بنا پر میں نے یہیں سے اس کی داستان پر شک کرنا شروع کر دیا تھا۔ وہ حکایت میں حقائق کا رنگ دینا چاہتا تھا اور اس کی خواہش تھی کہ اس میں رومانی کیفیات بھی پیدا کرے اگر ہم و سکی کا گھونٹ پی لیتے تو یہ واقعہ ضرور شام کے وقت ہوتا جب کہ سورج جہلم پر غروب ہو رہا ہوتا

## کوکھ جلی

ہے اور اس کی شعلہ باری پانی پر آہستہ آہستہ مدھم ہوتی نظر آتی ہے  
..... یہی جگہ تھی جہاں کلدیپ نے مجھے لٹک دیا، اور کلدیپ کا زاویہ  
نگاہ بھی وہی تھا جو میرا تھا اس منزل پر اس کی داستان میں شک کرنے  
کا مجھے کوئی حق نہیں پہنچتا تھا۔ یہ صریحاً غنڈہ گردی تھی۔ بہر حال رفیق  
نے اپنی بات کو جاری رکھا اور بولا۔

”ایک دن امر سنگھ کالج میں پیچ تھا اور مجھے یقین تھا کہ کینز۔  
یہ اس کی لڑکی کا نام تھا) کا بھائی ضرور پیچ دیکھنے کی غرض سے گیا ہوگا  
کیوں کہ وہ ایسی پر رونق جگہوں پر جانے کا بہت شوقین تھا۔ بلکہ میں نے  
اسے امیرا کدل پر جاتے بھی دیکھا تھا۔ میں نے کہا آج بڑا سنہری موقع  
ہے اظہار محبت کا! میں اپنی تمام ہمت کو جمع کروں گا۔ اور اس کے سامنے  
اپنے دل کا ماجرا کہہ سناؤں گا۔۔۔ میں آہستہ آہستہ کینز کے ہاں پہنچا  
گھر بھر میں میری بے تکلفی تھی۔ میں پردے ہٹاتا ہوا بیٹھک میں پہنچا، کھڑکی  
دریا کی طرف کھلی ہوئی تھی اور کمرے کے اندر سے کینز مجھے بخارچے پر کھڑی  
نظر آئی۔ اس وقت سورج ڈوب رہا تھا۔ اور بغیر و سکی کے  
رفیق نے سورج کو غروب کر دیا۔ چنانچہ سورج غروب ہو رہا تھا اور اس کی  
سنہری شعاعوں نے کھڑکی میں کھڑی کینز کے بالوں کو طلائی مغزی لگادی تھی  
گویا پچ سنہری موقع تھا اور کینز کی یہ پیاری پیاری شکل روشنی کے  
خلاف دھندلی دھندلی نظر آرہی تھی۔ میں دبے پاؤں آگے بڑھا اور آخر کی  
کھڑکی پر پہنچ کر میں نے اسے ایک دم بازوؤں میں لے لیا اور اس کا منہ  
چوم لیا۔ لیکن میں گھبرا کر الگ ہو گیا۔ وہ کینز نہیں بلکہ اس کی ماں تھی۔  
ہم دونوں دہرے تک ہنستے رہے۔ پہلے رفیق اور میں اور بعد میں کلدیپ

اور میں ایک دو باتیں غور طلب تھیں وہ یہ کہ کہانی کے آخر میں یک دم ایسا پلٹا داستان گوئی کے فن کے اعتبار سے بہت بُرائی بات ہو چکی تھی۔ لیکن رفیق بوڑھا ہو چکا تھا اور زمانے کی دوڑ میں پیچھے رہ گیا تھا دوسرے اپنی تمام داستانوں میں رفیق نے محبت میں اپنے آپ کو کامران ہوتا ہوا کبھی نہیں دکھایا تھا۔ محبت بڑے دلچسپ انداز میں شروع ہوتی تھی اور بس یوں ہی ختم ہو جاتی تھی، بسا اوقات ناکامی پر اپنی داستان کو ناکامی پر ختم کرنا رفیق کا فن تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اہل نظر فوراً اعتراض کریں گے کہ تمہارے ایسی شکل کے آدمی سے کون لڑکی محبت کر سکتی ہے؟ اس لیے وہ حدود کے اندر رہنا چاہتا تھا۔ کاش! کوئی لڑکی اس سے محبت کرتی تو وہ زندگی میں سچ کے سوا اور کچھ نہ کہتا۔

کلدیپ نے پوچھا۔۔۔۔۔ ”پھر تم نے اسے لڑک دیا؟“  
میں نے کہا۔۔۔۔۔ ”نہیں اس کے ساتھ جی بھر کر ہنس لینے کے بعد میں نے بھی اسے ایک جھوٹی کہانی سنا دی۔ اس وقت کلدیپ کھڑا ہو گیا اس نے میرے ساتھ پُرجوش مصافحہ کیا اور بولا ”بھاگیرتھ تم بہت بڑے آدمی ہو؟“  
اور میں حیران ہو کر نیچے دیکھنے لگا۔۔۔۔۔

میں اس تعریف سے مزید لطف اٹھانا چاہتا تھا میں نے کہا۔۔۔۔۔  
”اخلاق کے لیے بہت عالی ظرفی کی ضرورت ہے۔ میں نے کہیں پڑھا تھا کہ دسترخوان پر اگر مہمان سالن گرا دے تو میزبان کا یہ فرض نہیں کہ وہ کہے  
”نہیں نہیں کوئی بات نہیں“۔۔۔۔۔ بلکہ اسے یوں ظاہر کرنا چاہیے

جیسے اس نے دیکھا ہی نہیں؟

کلدیپ نے مجھے بتایا ”میں نے ایسے انسان بھی دیکھے ہیں جو خود بھی

## کو کھ جلی

تھوڑا سا لن گرا دیتے ہیں۔ کرنل فاکس میرا دوست تھا، اس کے ساتھ کھانا کھانے ہوئے میرے ہاتھ سے چمچہ گر گیا۔ میں نے اسی وقت دیکھا اس کی بیوی میز کے نیچے اپنا چمچہ گرا چکی تھی۔ . . . پھر کلڈیپ نے ایک اور داستان سنائی۔ پیسو پویمیا میں پرنس آف ویلز نے ہندوستانی فوجیوں کے ساتھ کھانا اسی انداز میں کھایا جس میں فوجی کھا رہے تھے حالانکہ کھانا انگریزی تھا اور ہندی فوجیوں کو اسے کھانے کا سلیقہ نہ آتا تھا۔

ایسا دوست، کلڈیپ میری زندگی سے نکل گیا، کتنا خوش ذوق آدمی تھا، لیکن معمولی سی بات پر ناراض ہو جانا بھی اس کی خوش ذوقی کی علامت ہے؛ کیا یہ غنڈہ گردی نہیں ہے کہ جو شخص پہلے ہی اپنے آپ کو مجرم تصور کرتا ہو، اس کو بتایا جائے کہ وہ مجرم ہے۔ . . . اچھا وہ میری زندگی سے نکل گیا ہے تو نکل جائے اس کا انداز ہمیشہ تا صحتا ہوتا تھا۔ وہ ہمیشہ مجھے بتانے کی کوشش کیا کرتا تھا کہ مہمانوں کے سامنے پھل چیر کر نہیں رکھنے چاہئیں۔ پھل ضائع بھی ہوتے ہیں۔ اور یہ طریقہ بھی نہیں ہے یوں بھی مہمان اپنی مرضی سے جو چاہتا ہے کھاتا ہے اور وہ بھی تھوڑا کھاتا ہے۔ لیکن جس مہمان کو میں اصرار سے کھلانا چاہتا ہوں اس کا کیا کروں۔ میں کلڈیپ کی باتوں کو سن لیتا مجھے اپنے آپ کو کم عقل کوتاہ بین مان لینے میں کبھی غدر نہ ہوتا تھا، میں ہمیشہ ثانوی درجہ حاصل کر کے خوش ہوتا تھا اور اس میں مجھے زیادہ راحت اور تسکین ملتی تھی۔

کلڈیپ چلا گیا ہے تو میں خورشید کو اپنا دوست بنا لوں گا۔ وہ اچھا آدمی ہے، کیوں کہ وہ اپنے آپ کو اتنا اچھا نہیں سمجھتا۔ ذہنی اعتبار سے وہ



اتنا بلند نہیں لیکن جب وہ میرے سامنے بھٹوڑی سی پی کر بہک جاتا ہے تو مجھے اچھی طرح پتا چلتا ہے کہ پینا بڑی چیز ہے۔ کلڈیپ کی مدلل باتوں سے مجھے پتا نہیں چل سکتا۔

کیا کلڈیپ ویسے دوست کے چلے جانے سے زندگی کا کھیل رک جاتا ہے؟ نہیں.... میں سولہ برس کا تھا جب میرے والد فوت ہوئے تھے اس وقت دنیا مجھے اپنی آنکھوں میں اندھیر نظر آتی تھی۔ میں سمجھتا تھا سب کچھ ختم ہو گیا یوں معلوم ہوتا تھا جیسے میں ایک کنوئیں میں ہوں، جس کے اوپر دیکھنے سے کنارے ملتے معلوم ہوتے ہیں۔ اور جیسے میں نیچے ہمیشہ کے لیے مدفون ہو جاؤں گا..... میں گھر کے باہر فرش پر اونڈھا پڑا رہتا تھا۔ بد رو کے کناروں کی کچی سٹی کو اپنے دل کے ساتھ لگاتا تھا، تو کہیں لشکین ہوتی تھی..... ایک جھن تھی جلن جو سارے جسم کا احاطہ کیے ہوئے تھی..

..... اس وقت مجھے خیال آیا کیا اس کے بعد میرا زندہ رہنا ناممکن ہو جائے گا۔ کیا میرا ہنسنا کھیلنا ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے گا؟ میں بد رو کے کنارے سے اٹھا اور غسل خانے میں چلا گیا۔ میں نے ہنسنے کی کوشش کی۔ یہ دیکھنے کے لیے کہ میں ہنس بھی سکتا ہوں۔ میں ہنس رہا تھا اور ساتھ کے کمرے میں میرے والد کی لاش پڑی تھی.....

اس کے بعد میری شادی ہو گئی اور بابو جی مجھے والد سے زیادہ عزیز معلوم ہونے لگے۔ میں نے عاطفت کے لیے اپنے سسر کو قبول کر لیا۔ اب میں ہنستا ہوں، کھیلتا ہوں اور قریب قریب اپنے والد کو بھول چکا ہوں بلکہ ان کی زندگی میں مجھے اتنی آزادی نہ تھی۔ اب میں جو چاہتا ہوں کرتا ہوں مجھے کوئی روکنے والا نہیں۔ ایسے جیسے کلڈیپ سے علاحدہ ہو کر سبک ہو رہا

ہوں اور اگر جیتی ہنستی کھیلتی چلی جائے — نہیں نہیں .....  
 اس وقت تک رات پڑ چکی تھی اور کھانا تیار ہو چکا تھا، گن آنند، آیا  
 اور پریشمیری نوکرائی جو برتن لوٹا کر لی تھی گھبرا گھبرا کر ادھر ادھر دوڑ رہے  
 تھے انھیں سانس تک لینے کی فرصت نہ تھی۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے گھر میں  
 بہت سے مہمان آگئے ہوں۔ حالانکہ بابو جی آئے اور یوگ کو بھی ساتھ لیتے  
 گئے جس کے نام سے گھر کی رونق تھی اور جو ہر لحظہ کوئی نیا قضیہ کھڑا کیے  
 رہتا تھا۔

اس وقت میرا بھی جی چاہنے لگا کہ کھوڑی سی پی لوں اور شمشان کی  
 سی خاموشی میں کچھ ارتعاش پیدا کروں، پتا جی کی محنت پر آنسو بہاؤں اور  
 کلدیپ کی فاتحہ خوانی کر لوں۔ سارے بدن میں متواتر سوچتے رہنے سے جو  
 تناؤ پیدا ہو گیا تھا اسے آسودہ کرنے کو جی چاہتا تھا، سردار فتح موہنہ،  
 اس وقت سونے کی تیاریاں کر رہے تھے اور کیرتن سوہلا کی آواز دروازے  
 کی جالی سے چھن کر مجھ تک آرہی تھی — کیسی آرتی ہوئے بھوکھنڈنا تیری  
 آرتی انا ہتا شبد واجنت بھیری ہے۔۔۔ اور ان آن گنت بھیریوں کی آوازیں  
 میرے کانوں میں گونجنے لگیں الفاظ معدوم ہو گئے اور صرف آوازیں غیر متعلق  
 شور ہو کر میرے تکلیل کی معاون ہو گئیں — میں سوچتا رہا سوچتا رہا اس  
 کرسی میں دبکا ہوا اور ابھی تک کھانے کے لیے مجھے آواز نہیں دی گئی تھی۔  
 اگر میری دوسری شادی ہو بھی جائے تو میں زندگی کو استوار کرنے  
 سے پہلے اتنی کشمکش نہیں کر سکتا۔ دراصل میں اتنا تھکا ہوا ہوں کہ اب دوسری  
 شادی کا متحمل نہیں ہو سکتا۔

لیکن یہ آسان بات ہے۔ آخر شادی کسی پڑھی لکھی لڑکی سے ہو گی۔

جو ہر بات کو ہمدردی کے نقطہ نظر سے دیکھے گی.... پلنگ پر بیٹھی ہے ایک مردار کی دھوئی پہنے۔ جس کا کنارہ بہت چوڑا اور سیاہ ہے اور یہ پتا نہیں چلتا کہ اس کے بال کہاں سے شروع ہوتے ہیں اور ساری کا پلو کہاں ختم ہوتا ہے دھوئی کی زمین سنیالی ہے اور اس کے کھوڑے کھوڑے فاصلے پر تین تین حلقے نظر آتے ہیں۔ اوپر کا حلقہ سیاہ ہے جو پلو سے مطابقت رکھتا ہے درمیان کا زرد اس کے اندر کا سفید، پھر نیلا اور آخر میں دھوئی کی زمین ابھری ہوئی ہے....

وہ خاموش ہے۔ گنواروں کی طرح نہیں ہنستی اور نہ جھوٹ کو اتنا بُرا سمجھتی ہے۔ شاید برا سمجھتی ہو۔ لیکن کہتی نہیں۔ بڑی خاموشی سے مسکرائے جاتی ہے....

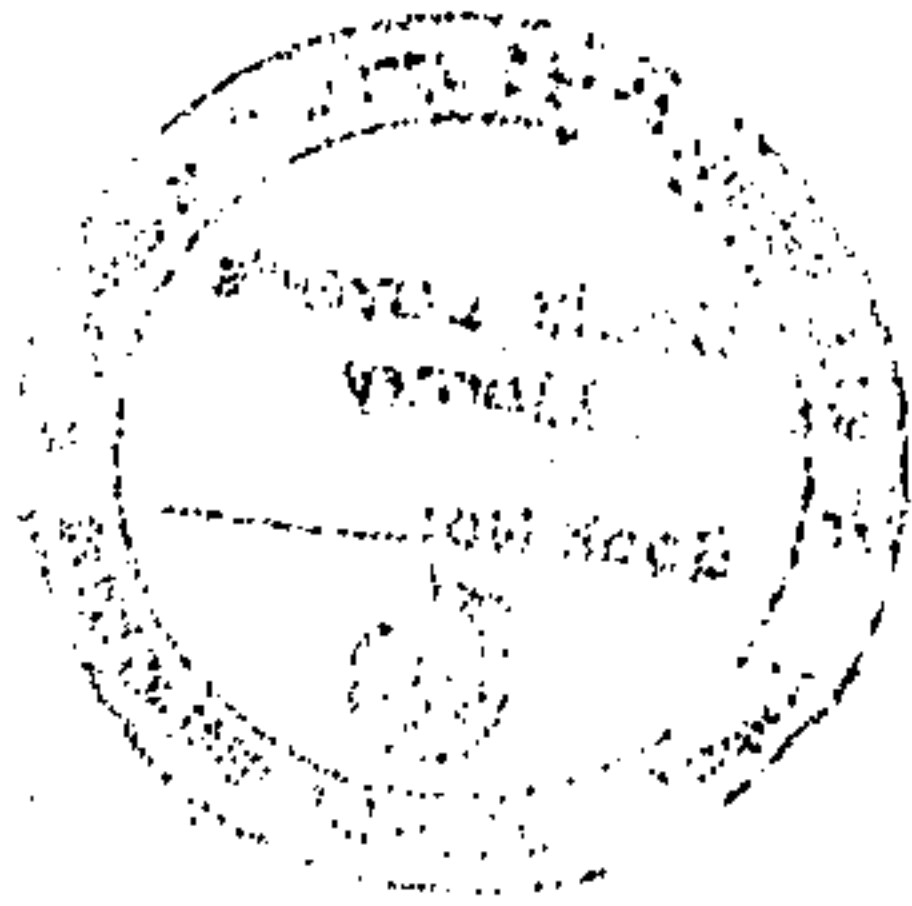
میں اس سے کہہ رہا ہوں کہ — "بیون کی اس دوڑ میں تھک گیا ہوں سکھ داں! میں شاید تمہارے ارمانوں کو پورا نہ کر سکوں۔ لیکن میں تمہیں محبت اور سکھ دے سکتا ہوں ایسی محبت نہیں جو شعلہ جوالہ ہو۔ ہاں البتہ ایک دھیمی دھیمی آج جس میں محبت پختہ بھی ہوتی ہے اور خوش ذائقہ بھی.... تمہیں دو یتیم بچے بھی سنبھالنا ہوں گے اور ان سب باتوں کے جواب میں وہ شرمناک سر ہلا دیتی ہے گویا اسے سب کچھ منظور ہے!

وہ کہہ رہی ہے — "میرا خیال ہے، تمہارے دوستوں کو کھانے پہ بلاؤں!"

"ہاں بلاؤ سکھ داں! یہ تم نے میرے من کی بات کہہ دی" — اور ہم ایک فہرست مرتب کرنے لگتے ہیں۔ دوست آنے ہیں کھانا کھانے ہیں۔ امریکن سینڈ ٹائی میز پر رکھی جاتی

ہے اور میرے دوست اسے اسٹینڈ پر سے اٹھا کر کھاتے ہیں۔ اس خیال میں کہ کوئی چھلکا اتارنے کی ضرورت نہیں لیکن وہ نہیں جانتے کہ وہ ٹافی اسٹینڈ سمیت اٹھائی جاتی ہے اور اسے منہ میں ڈال کر اسٹینڈ رکھ دیا جاتا ہے۔ میں سر ایس ہو کر ادھر ادھر دیکھتا ہوں۔ سکھ داں سب کچھ جانتے ہوئے بھی میرے دوستوں کی طرح غلط طریقے سے ٹافی کھاتی ہے۔۔۔۔

اس کے بعد مجھے جانتگوسی ہنسی سنائی دی۔ میرا ماحول اس وقت اس قدر پرسکون تھا کہ میں جیتی کی ہنسی کو برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ دراصل۔۔۔۔ دراصل میں چاہ رہا تھا کہ یہ ہنسی ختم ہو جائے۔۔۔۔ مجھے کھانے کے لیے آواز دی گئی۔ میں اٹھا جب کہ مجھے اپنی نگاہوں کے افق پر وہ بوڑھا مال اپنے بازو ہلاتا ہوا گزرتا نظر آنے لگا۔





## ادارے کی دیگر ادبی کتب

- 1- پریم چند کے 15 منتخب افسانے انتخاب: شمیم حنفی 200/- روپے
- 2- چند ہم عصر بابائے اردو: مولوی عبدالحق 200/- روپے
- 3- انتخاب کلام میر بابائے اردو: مولوی عبدالحق 200/- روپے
- 4- دیوان غالب (فرہنگ کے ساتھ) مرزا اسد اللہ خاں غالب 300/- روپے
- 5- دیوان میر تقی میر میر تقی میر 100/- روپے
- 6- مرآة العروس ڈپٹی نذیر احمد 120/- روپے
- 7- باغ و بہار (فرہنگ کے ساتھ) میر امن دہلوی 200/- روپے
- 8- فردوس بریں عبدالحلیم شرر 120/- روپے
- 9- مسدس حالی (جدید ایڈیشن) مولانا الطاف حسین حالی 160/- روپے
- 10- پطرس کے مضامین پطرس بخاری 80/- روپے
- 11- عروض سب کے لیے کمال احمد صدیقی 250/- روپے
- 12- ستر مایہ کیفی اعظمی 300/- روپے
- 13- کوکھ جلی راجندر سنگھ بیدی 200/- روپے
- 14- ایک چادر میلی سی راجندر سنگھ بیدی 200/- روپے